حیدرآباد ٹیچر

بابتہ آبان سنہ ۱۳۴۶ف

فہرست مضامین

جلد (۱۲) شمارہ (۱)

تاریخ علم الارقام

مولوی سید عبدالحکیم صاحب صایم - یس - سی - یل - ٹی

تاریخ عالم میں وہ دن بھی اپنی عظمت اور اہمیت کے مدِ نظر عجیب ہوگا جس دن کسی انسان نے دنیا کی مختلف لاتعداد اشیاء کے شمار کے لئے کوئی اصطلاح وضع کی ہوگی اس اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ علم الارقام یا علم اعداد و شمار صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟

کیا دولت مند اپنے روپیوں کا، غریب اپنے پیسوں کا، جاگیردار اپنی جاگیروں کا، بادشاہ اپنی اقلیموں کا، کپتان اپنے سپاہیوں کا، محاسب اپنے لین دین کا حساب کر سکیگا؟ حقیقت یہ ہے کہ علم الارقام کے ختم ہوتے ہی دنیا کی معاشرتی اور تمدنی تنظیم کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور انسان اپنی ارتقا کی ابتدائی منزل پر پھر واپس آجاتا ہے علم الارقام کی موجودہ اصطلاحات اور علامات جن سے اشیاء عالم کی تعداد اور مقدار ظاہر ہوتی ہے کیونکر ظہور میں آئیں - بتدریج اُن میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اور بالآخر اعداد ارقام کا موجودہ آسان طریقہ کب اور کیونکر مدوّن ہوا۔ ذیل میں ان امور پر روشنی ڈالی جائے گی۔

بچہ میں پیدائش کے بعد جس وقت سے مختلف اشیاء میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے حقیقت میں اُسی وقت سے وہ غیر محسوسانہ طریقہ پر علم الارقام کا سبق بھی شروع کر دیتا ہے۔

وہ سمجھتا ہے کہ ایک شئے یہ ہے۔ ایک یہ ہے اور ایک یہ ہے اور بالکل اسی طرح سلسلہ اعداد میں بنی نوع انسان کو جو پہلا عدد ملا وہ "ایک" ہے لیکن ابتدائی منزل سے جب وہ کچھ آگے بڑھا اور اُس کو ایک سے زیادہ اعداد کے شمار کی ضرورت پڑی تو

اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کر سکا اور ان اعداد کو اکائیوں کا مجموعہ سمجھے۔

چنانچہ اہرام مصر کے ایک کتبہ سے جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ سنہ ۱۷ ق م تا سنہ ۱۱ ق م کے درمیان کئی سال کا ہے یہ پتہ چلتا ہے کہ تقریباً سنہ ۳۴ ق م میں ہر بڑے عدد کو لفظ کثیر سے موسوم کرتے تھے۔ آج کل بھی اکثر ناخواندہ اشخاص بڑے اعداد کے شمار میں کوئلہ یا پنسل سے کسی دیوار یا کاغذ پر اتنے ہی نشانات بنا لیتے ہیں جتنے کہ اعداد ہوتے ہیں۔ لیکن ابتدائی گہوارۂ طفولیت سے نکلکر جب انسان کچھ آگے بڑھا تو ایک کے بعد اُس نے پانچ تک کے اعداد سیکھے۔ قرینِ قیاس یوں ہے کہ پانچ کا عدد سیکھنے میں انسان ایک بڑی حد تک اپنے ہاتھ کی پانچ انگلیوں کا مرہون منت ہے۔ تقریباً تمام قدیم زبانوں میں پنجہ (ہاتھ) اور عدد پانچ کا ماخذ ایک ہی ہے۔ قدیم کتبوں اور نقوش کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں عموماً بڑے اعداد کے اظہار اور شمار میں ایک یا دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اور پانچ سے بڑے اعداد کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی اصطلاح نہ تھی۔ عدد پانچ کو بھی کھلے ہوئے ہاتھ کی شکل سے ظاہر کرتے تھے گو اس عدد کی تحریری ساخت میں اس وقت تک بہت سی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں تاہم تقریباً ہر زبان میں عدد پانچ کی کشش آج بھی کھلے یا بند ہاتھ کی شکل سے ملتی جلتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اس عدد کی ساخت ملاحظہ ہو:—

رومن	قدیم عربی	قدیم ہندوستانی	قدیم جرمن	فارسی
۷	٤	٤	٦	۵

غالباً یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس عدد کو انسان کی اکثر و بیشتر حسابی ضروریات میں خاص دخل ہے۔

انعام و اکرام۔ ملازمین کی تنخواہیں، مذہبی فرایض عموماً پانچ یا اس کے ضعف بھی ادا ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جاوا اور میکسیکو کے باشندوں میں ہفتہ بھی بجائے سات دن کے پانچ دن کا ہوتا ہے اب تک دنیا میں صرف دو قبائل ایسے دریافت ہوئے ہیں جو پانچ یا پانچ کے ضعف میں شمار نہیں کرتے اُن میں ایک نیوزیلینڈ کے قدیم باشندے اور دوسرے بولن نامی مغربی افریقہ کے قبایل ہیں ان میں اول الذکر گیارہ یا گیارہ کے ضعف پر شمار کرتے ہیں

اور اخری الذکر سات یا سات کے ضعف سے کام لیتے ہیں۔

پانچ کا عدد سیکھنے کے بعد جب انسان نے کچھ اور ترقی کی تو دس تک جو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کا مجموعہ ہے شمار کرنا سیکھا۔ کچھ قدیم زبانیں اب تک ایسی موجود ہیں جن میں اولیں دس اعداد کے نام اُن انگلیوں کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں جن سے کہ وہ ظاہر کئے جاتے تھے۔

رومن میں پانچ کا ہندسہ کھلے ہوئے ہاتھ کے مشابہ V اس طرح لکھتے ہیں اور دس کا ہندسہ X اس طرح لکھتے ہیں جس کی ساخت پر غور کیا جائے تو دو پانچ (V) ایک دوسرے سے ملا کر اوپر نیچے اس طرح X لکھ دیئے گئے ہیں ہندسہ دس کی یہ علامت اس امر کی جانب اشارہ کر رہی ہے کہ اہل روم پانچ کے بعد دس پر کیسے پہنچے ایسے بھی قبائل تھے جو دس سے بھی تجاوز کر گئے اور دونوں ہاتھ اور پیروں کی انگلیوں کی مجموعی تعداد ملا کر ۲۰ کے ہندسہ کو معیار عدد قرار دیا۔ ۲۰ سے زیادہ اشیاء کو بیس کے ضعف پر شمار کرنا شروع کیا۔ مثال کے طور پر قبیلہ ایزٹیکس جو میکسیکو کے باشندے ہیں۔ اشیاء کو بیس یا بیس کے ضعف پر شمار کرتے ہیں۔

ہماری زبان میں اس کے لئے لفظ "کوڑی" یا بیسی ہے اور ہندوستان میں بعض چیزوں کا شمار اب بھی کوڑیوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً ٹوپی، موتیوں کے گچھے وغیرہ۔ انگریزی زبان میں بھیڑوں کی تعداد اب بھی کوڑیوں میں شمار کی جاتی ہے فرانسیسی زبان میں اب ایسے متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معنی چار بیسی اور دس بیسی یا تین بیسی اور دس ہوتے ہیں لیکن نیوزیلینڈ اور مغربی افریقہ کے دو قبیلوں کے علاوہ جن کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے تقریباً دنیا کی تمام قوموں نے دس کو معیار ترقی عدد قرار دیا۔ ابتدائی اقوام کے لئے دس تک کا شمار کسی حد تک آسان تھا۔

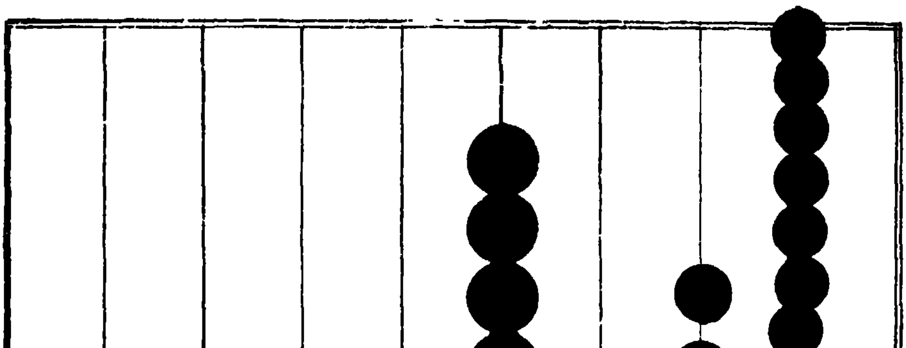
لیکن بڑے اعداد کے گننے میں اُن کو بڑی دشواریاں پڑیں چنانچہ آج کل کے وحشی بھی کثیر اعداد کا شمار بغیر دو آدمیوں کی مدد کے نہیں کر سکتے۔ ان دو آدمیوں میں ایک اکائیوں کے اولیں دس عدد انگلیوں کے ذریعہ گنتا ہے اور دوسرا دس کا ایک گروپ یا گروہ بنتے ہی اپنے ہاتھ کی ایک انگلی پکڑ لیتا ہے۔

اس طرح دوسرا شخص جتنی دہائیاں بنتی جاتی ہیں ان کا شمار کرتا جاتا ہے اگرچہ

اسی طریقہ میں ایک آدمی کو اس طرح سبکدوش کیا جا سکتا تھا۔ کہ ہر دہائی کی تکمیل پر کسی خاص قسم کا نشان بنا دیا جاتا۔ لیکن کہا یوں جاتا ہے کہ اب بھی دنیا میں متعدد قبیلے ایسے موجود ہیں جو دس سے بڑے اعداد کو بغیر دو آدمیوں کے شمار نہیں کرسکتے۔

بہت سی قومیں جو طبعاً ترقی و تہذیب کی جانب مائل تھیں وہ چند قدم آگے بڑھیں اور گولیوں یا لکڑی کے ٹکڑوں کو دس کی قطاروں میں ترتیب دیکر شمار کرنیکا طریقہ ایجاد کیا۔

یہی طریقہ کچھ عرصہ کے بعد درجہ تکمیل کو پہونچکر تختہ شمار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ آلہ شمار یونان، مصر، ایران، ہندوستان، چین، و جاپان، اور میکسیکو میں ایک مدت تک مستعمل رہا۔ اور روس، چین اور جاپان میں اب بھی جا بجا استعمال کیا جاتا ہے اپنی سادہ ترین شکل میں تختہ شمار لکڑی کا مستطیل یا مربع نما ایک ایسا تختہ ہوتا ہے۔ (شکل نمبر ۱) جس کی سطح پر گول خانے کندہ ہوتے ہیں۔

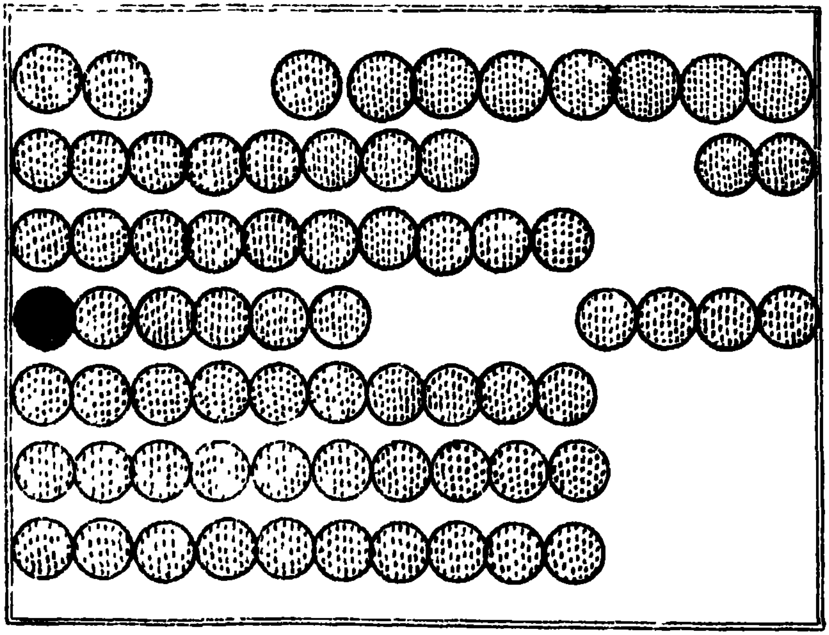


کسی عدد کو ظاہر کرنے کے لئے پہلے خانہ میں اتنی گولیاں رکھی جاتی ہیں جتنی کہ اس عدد میں اکائیاں ہیں دوسری قطار کے خانوں میں اتنی گولیاں یا شمارہ رکھے جاتے ہیں جتنی کہ اس عدد میں دہائیاں ہیں اور علیٰ ہذا القیاس بقیہ قطاروں کے خانوں کی خانہ پری حسب ضرورت کرلی جاتی ہے۔ مثلاً شکل بالا میں جو تختہ شمار دکھایا گیا ہے اُس میں اکائی کی قطار میں آٹھ گولیاں ہیں۔ دہائی میں دو اور سیکڑے میں صفر اور چوتھی یعنی ہزار کی قطار میں چار گولیاں ہیں۔ اس طرح پر جو عدد ظاہر ہو رہا ہے وہ

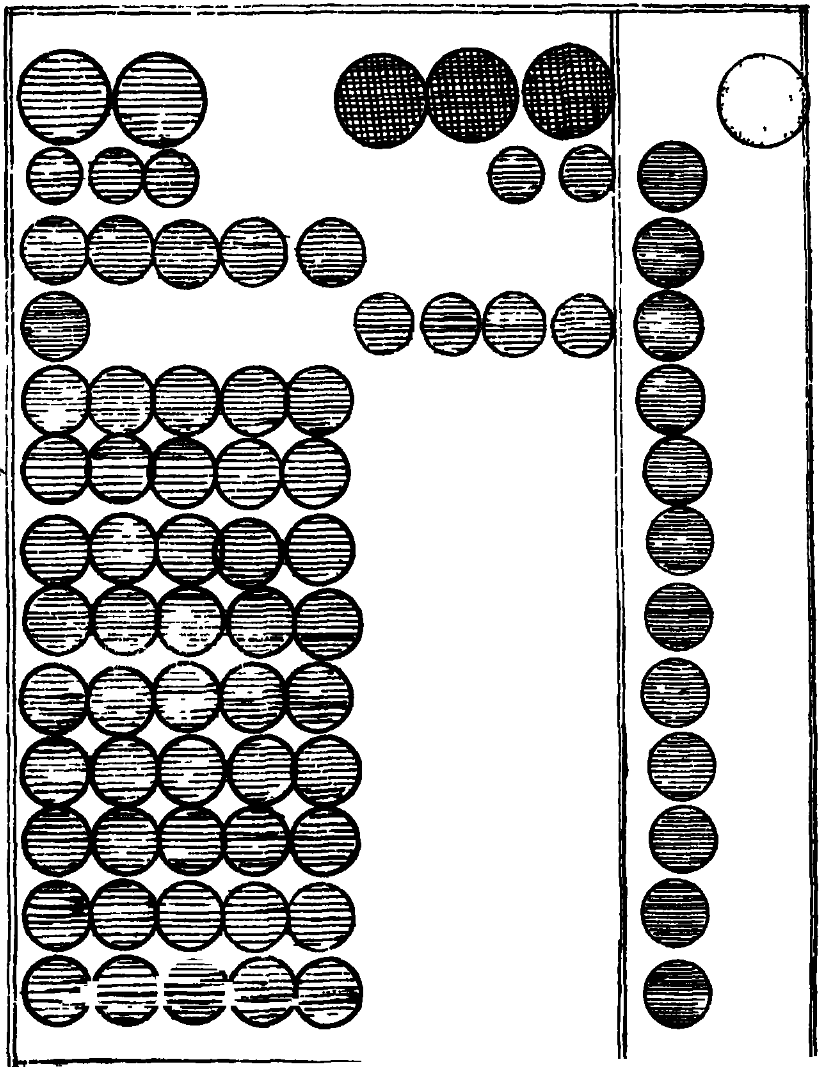
۰۲۸ھ سے عملاً جب اشیاء کی تعداد کو شمار کرنا ہوتا تھا تو ہر چیز کی بجائے ایک ایک گولی پہلی قطار کے خانوں میں رکھتے تھے۔ اور جیسے ہی کہ پہلی قطار میں دس گولیاں آجاتی تھیں وہ سب گولیاں اٹھالی جاتی تھیں اور اُن کی بجائے دوسری قطار میں ایک گولی رکھدی جاتی تھی۔ پہلی، دوسری، تیسری قطاروں کی خانہ پُری کا یہ سلسلہ اس طرح جاری رکھا جاتا تھا یہاں تک کہ اشیاء کی تعداد معلوم ہو جاتی تھی۔ میکسیکو کے قدیم باشندے جو تختہ شمار استعمال کرتے تھے ان میں لکڑی کے ایک ایک مستطیل نما کندے پر متعدد دھات یا بانس کی تیلیاں متوازی قطاروں میں جڑی رہتی تھیں۔ ان تیلیوں میں تسبیح کے دانوں کی طرح گولیاں آویزاں رہتی تھیں۔ اس کا استعمال بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ روس میں جس قسم کا تختہ شمار استعمال ہوتا ہے، وہ پہلے دو تختوں سے زیادہ بہتر ہے ان میں تار ایک مستطیل نما چوکھٹے یا فریم میں جڑے رہتے ہیں اور دس یا نو دانے مستعملاً ہر تار میں آویزاں رہتے ہیں ان دانوں کے لئے طول میں جتنے تار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے تار طول میں کم و بیش دو چند رہتا ہے استعمال کرتے وقت یہ تختہ اُفقی سمت میں لٹا دیا جاتا ہے (جیسا کہ شکل نمبر ۲ میں دکھلایا گیا ہے)

اور تمام دانے ایک سمت میں داہنی یا بائیں جانب مرتب کردئے جاتے ہیں

(شکل نمبر ۲)



(فرض کرو کہ بائیں جانب) اب کس عدد کو شمار کرنے کے لئے داہنی جانب پہلے تار پر اتنے ہی دانے منتقل کر دیے جاتے ہیں جتنی کہ اکائیاں ہیں۔ بعد ازاں دوسرے تار پر داہنی جانب اتنی گولیاں منتقل کر دی جاتی ہیں جتنی کہ دہائیاں ہیں اور یہی صورت حسب ضرورت تیسرے، چوتھے اور باقی تاروں کے لئے رہتی ہے چنانچہ شکل میں دائیں جانب کے دانوں کا شمار کرتے ہوئے عدد ۴۰۲۸ ہے۔ اس تختہ شمار پر اعداد زیادہ سرعت سے محسوب کئے جاتے ہیں اگر ہر تار پر کے دانوں کے رنگ مختلف ہوں اور ان پر ۱، ۲، ۳، تا ۹ تک نمبرات درج ہوں۔



(شکل نمبر ۳)

شکل نمبر ۳ سے وہ تختہ شمار ظاہر ہوتا ہے جو چین اور جاپان میں عام طور پر مستعمل ہے یہاں پر ایک قدم ترقی کی جانب اور بڑھایا گیا۔ اور ہر ایک تار میں پانچ دانوں کی بجائے صرف ایک دانہ رکھا گیا۔ لیکن یہ دانہ شکل سے ظاہر ہے فریم کے ایک دوسرے حصہ میں ہے۔

تختہ شمار میں اس وقت ۴۰۲۸ ہے اس تختہ کے ذریعہ دس کھرب تک عدد ظاہر ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ماہر فن جاپانی اس تختہ کے ذریعہ اتنی تیزی سے شمار کر سکتا ہے جتنی تیزی سے کوئی شخص گن سکتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ان تختوں سے صرف اعداد شماری کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ حساب کے ابتدائی چار قاعدے جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کا کام بھی زبانی۔ تھوڑی سی ترمیم کے بعد ایسے ہی تختوں سے چلتا تھا۔

تختہ شمار درحقیقت اعداد کے شمار کرنے کا اصول اعشاریہ کے تحت ایک عملی طریقہ تھا۔ جس میں ہندسوں کی مقامی قیمت سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ لیکن قدیم زمانہ میں اعداد لکھنے کا طریقہ بالکل مختلف تھا چنانچہ انسان ہزارہا برس تک اعداد کی لکھت کے غلط راستہ پر پڑ کر بھٹکتا رہا۔ اور جب تک دوسرے ہندسوں کی طرح انسان نے صفر کے لئے علامت نہ بنائی وہ ہندسوں کو اعشاریہ کے طریقہ پر لکھنے میں کامیاب نہ ہوا۔ صفر کی علامت کی ابتدا کب سے ہوئی۔ اس کی تاریخ کا صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا۔ خیال یہ ہے کہ یہ علامت ہندوستان میں پانچویں صدی کے ختم پر وضع ہوئی لیکن ہندوستان میں قدیم سے قدیم عہد کا جو کتبہ ملتا ہے اس میں صفر کی علامت کا وجود آٹھویں صدی سے چلتا ہے۔

صفر کے علاوہ دوسرے ہندسوں کی علامات کی ایجاد صفر کی وضعات سے بہت پیشتر ہو چکی تھی۔ لیکن ان اعداد کی وضعات بھی زبانی اعداد و شمار سے بہت مدت بعد عمل میں آئی ابتدا میں جس طرح اعداد کا تصور اکائیوں کے مجموعہ سے ذہن نشین ہوا تھا۔ اسی طرح ان کے لئے بے وضع علامات اور اشارات میں بھی ویسی ہی مطابقت اختیار کی گئی اس بنا پر ابتدا میں انسان اس کے سوا کچھ نہ کر سکا کہ ایک کے لئے ایک لکیر دو کے لئے دو لکیریں۔ تین کے لئے تین لکیریں بنا دے چنانچہ اٹرسٹان میں بمقام

ٹریلی ضلع کیری کے ایک کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۲۹۵ ق ۔م کا ہے اور اس میں سات سال کو سات کھڑی لکیروں سے ظاہر کیا ہے چنانچہ یورپ میں ایک، دو، تین اور چار کے لئے اب بھی طول خطوط مستعمل ہیں۔ مثلاً I و II و III و IIII

چ ر والوں نے بجائے طولی خطوط کے عرضی خطوط مثلاً = و ≡ وغیرہ اختیار کئے گئے لیکن ظاہر ہے کہ بڑے اعداد کے لئے یہ طریقہ کتنا ناقابل عمل ہے۔ مثلاً اگر ہم سات کا عدد لکھنا چاہیں تو سات خطوط اور پچیس کا عدد لکھنا چاہیں تو پچیس خطوط یکے بعد دیگرے بنانا پڑیں گے ۔ اس لئے بڑے اعداد کو ظاہر کرنے کے لئے خاص علامات کے وضع کرنے کی ضرورت پڑی۔ اور دس اور سو کے لئے جلدی ہی دو جدید علامات وضع ہوئیں۔ چنانچہ قدیم مصری اور فینیقی تحریروں میں اکائی کا اعادہ حسب ضرورت نو تک کیا جاتا تھا۔ اور پھر دس لکھکر دس کا اعادہ نو مرتبہ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اعداد کے اظہار کا یہ طریقہ قدیم رومیوں میں صدیوں تک جاری رہا۔ بعد میں بغرض اختصار رومیوں نے پانچ اور پچاس کے لئے دو علامتیں اور بنائیں۔ یونانیوں نے تقریباً تین سو برس قبل مسیح اعداد کے اظہار کا ایک جدید طریقہ نکالا۔ اور یہ طریقہ غالباً انہوں نے اسکندریہ کے باشندوں سے سیکھا۔ اس طریقہ میں اعداد کے لئے بجائے مستقل علامات کے وضع کرنے کے حروف تہجی سے جو پہلے وضع ہو چکے تھے کام لیا گیا۔ چنانچہ نو تک کے اعداد اولیں نو حروف تہجی سے ظاہر کیے گئے یعنی حروف اول کی قیمت ۱، حرف دوم کی ۲، حرف سوم کی ۳ تا اینکہ حرف دہم کی قیمت دس رکھی گئی۔ اس کے بعد یہ ترتیب دس دس کے اضافہ سے رکھی گئی۔ یعنی گیارہویں حرف کی قیمت ۲۰۔ بارہویں کی ۳۰۔ اور یہاں تک انیسواں حرف ۱۰۰ پر ختم ہو جاتا تھا۔ اور بعد کے حروف میں سو سو کا اضافہ کر کے ایک ہزار پر ختم کر دیتے تھے۔ ایسا کرنے کے لئے یونانیوں کو ۲۸ حروف تہجی کی ضرورت تھی لیکن ان کی زبان میں صرف ۲۴ حروف تھے۔ لہذا انہوں نے فینیقی زبان سے بقیہ حروف تہجی لے کر اس کمی کی تکمیل کی۔ اور عدد کے لکھنے کے بعد عدد کے اوپر داہنی طرف ایک چھوٹا سا ضمہ (´) بنا دیتے تھے۔ جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ یہ حروف تہجی نہیں ہیں مثلاً عدد گیارہ دسواں اور

پہلا حرف تہجی ملاکر یوں (ʼ‎ᘓ L) لکھتے تھے۔ اسی طرز پر اٹھائیس (K ĥ ʼ) یوں لکھتے تھے بعد میں یہی چیز عربوں میں حساب جمّل کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کو اسلام کے علماء ریاضی نے درجات و دقایق و ثوانی کے تعین میں اور علماء جغرافیہ نے عرض البلد و طول البلد کے ذکر میں استعمال کیا ہے اور پھر شعرائے متاخرین نے اس سے مادہ ہائے تاریخ کے نکالنے میں مدد لی اس میں شک نہیں کہ یہ علامات ابتدا میں صرف ان نتائج کے اندراج میں مشتمل ہوتی تھیں جو تختہ شمار سے عملی طور پر حاصل کئے جاتے تھے ضرب و تقسیم کے عمل ان علامات کے ذریعہ آسان نہ تھے۔ صرف چند بہت بلند پائے کے ریاضی دان ملتے ہیں جنھوں نے ان علامات کے ذریعہ ضرب و تقسیم کے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی مثلاً تقریباً سنہ ۱۵۰ ق۔م میں اسکندریہ کا ایک ہیرو نامی ریاضی دان ۱۲، ۱۸ کی ضرب کا عمل یوں کرتا ہے یہ عمل یونانی حروف تہجی اور ان کی معینہ ارقام کے لحاظ سے کیا گیا۔ لیکن ہم اُن کو بغرض سہولت ابجد کے عربی حروف تہجی کی صورت میں تبدیل کئے دیتے ہیں۔

(۸ + ۱۰)(۲ + ۱۰) = ۱۸ × ۱۲ = (ح + ی)(ج + ی) = ح ی × ج ی

= ۲ (۸+۱) + ۱۰(۸ + ۱۰) = (ج+ی) ج + (ح + ی) ی =

= ۲۴ + ۲۰ + ۸۰ + ۱۰۰ = دک + ل + ف + ق =

= ۲۲۴ = دل ر =

اس طرح دنیا کی قدیم متمدن قومیں ہزارہا برس تک اس عقدۂ علمی کے سلجھانے میں کوششیں کرتی رہیں۔ لیکن قدرت نے اس کی کامیابی کا شرف مشرق کے لئے رکھا تھا۔ اہل ہند اس فن میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے اعداد اور ارقام کی علامتیں مقرر کیں اور بتدریج ان کو ترقی دیتے رہے لیکن ان کی یہ ترقی صرف اُن ہی تک محدود رہی۔ یہاں تک کہ ۸۰۰ صدی مسیحی کے بعد عربوں نے اس فن کو اہل ہند سے لے کر تمام متمدن ممالک میں پھیلا دیا۔ بقیہ مضمون میں اس امر کا ذکر ہوگا کہ موجودہ علم الارقام کس طرح اہل ہند سے عربوں میں اور عربوں کے ذریعہ یورپ اور دیگر متمدن ممالک میں پھیل گیا۔

آفتاب رسالت کے طلوع ہوتے ہی اہل عرب خواب غفلت سے بیدار ہوئے

اور اپنے ہادیٔ اعظم[۲] کی رہبری میں نہایت سرعت سے دنیا کی متمدن ترین قوم بن گئے۔ وہ جذبہ کشور کشائی کے ساتھ ساتھ حصول علم کا بھی شوق رکھتے تھے۔ علم کے لئے اُس وقت عربوں کی نگاہیں دو ممالک پر پڑیں شمال میں یونان اور مشرق میں ہندوستان گو ابتداً ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کے فتوحات ملتان سے آگے نہ بڑھے تاہم عربوں کے تجارتی تعلقات اہل ہند سے محمد بن قاسم کے حملے سے بہت پیشتر سے قائم تھے۔

اور جب ان کی شہنشاہیت ہندوستان کے حدود تک پہونچ گئی تو یہ تجارت قدرتاً اور بڑھ گئی۔ اس وقت جو تقریباً ۸۰۰ء کا زمانہ تھا عرب تاجروں نے دیکھا کہ ہندوستانی تجار اپنے حساب وکتاب میں ایک جدید قسم کے نہایت آسان ارقام عددی استعمال کرتے ہیں جس میں معیار عدد دس ہوتا ہے اور اس میں نو ہندسوں کے علاوہ ایک ہندسہ صفر اور ہوتا ہے اور انہیں دس ہندسوں کے ذریعہ بہ تقدیم وتاخیر مراتب قیمت باقی چھوٹے و بڑے تمام اعداد حاصل ہو جاتے ہیں خیال یہ ہے کہ ابتدا میں انہیں تاجروں کے توسط سے یہ اعداد عشری کا جدید طریقہ عرب تک پہنچا ہندوستان میں اس طریقہ کی بنیاد کب اور کس نے رکھی اس کا ٹھیک تاریخی پتہ نہیں چلتا۔ آریہ بھٹہ جو پانچویں صدی میں ہندوستان کا نہایت مشہور ریاضی دان گذرا ہے اُس کی تصنیفات میں ان اعداد عشری کا استعمال نہیں ہے قدیم سے قدیم تاریخ جس میں اس طریق کتابت کا استعمال عرب میں معلوم ہوا ہے۔ وہ ۷۷۳ء کا ہے۔

یہ خلیفہ المنصور کی خلافت کا آخری زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے دو مشہور علماء ریاضی آریہ بھٹہ اور برہم گپتا کی تصانیف کے علاوہ چند علم نجوم کی کتابیں بھی خلفاء عباسیہ کے دار الخلافہ بغداد میں ہندوستان سے حاصل کی گئیں۔ ان کتب میں علم ہیئت کے متعلق چند جدول بھی تھے جن میں ارقام ہندسہ کے نو ہندسوں کے علاوہ صفر کا بھی استعمال تھا۔

اگرچہ رائج الوقت اعداد عشری کے موجد اہل ہند ہیں اور اسی بناء پر عربوں نے اس کا نام "ارقام ہندیہ" رکھا۔ مگر اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس علم کی تشہیر اور تحفظ کے حقیقی مجدد اور شرف کے مستحق اہل عرب ہیں خلیفۃ المامون (۸۱۳ تا ۸۳۳) کے عہد میں ایک علمی سفارت قسطنطنیہ اور دوسری ہندوستان اس غرض کے لئے

روانہ کی گئی کہ وہ یونانی اور ہندوستان کے تمام سائنٹفک علوم و فنون کو حاصل کر کے بغداد لائیں ہندوستان میں جو سفارت بھیجی گئی اس کے ساتھ محمد ابن موسیٰ ابو جعفر الخوارزمی تھے۔ تاریخ ریاضیات میں الخوارزمی بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تقریباً ۸۳۰ء میں جب الخوارزمی ہندوستان کی سفارت سے واپس ہوا تو علم الحساب اور الجبر پر چند و کتابیں لکھیں۔ یورپ میں الجبرا اور ارقام ہندیہ کے اصول پر عشری اعداد کی بنیادیں ان ہی تصانیف کی مرہون منت ہیں۔

یہ ارقام عشری جس میں دسواں ہندسہ صفر ہوتا ہے یورپ میں کیونکر اور کب پہونچے؟ سنسکرت زبان میں صفر کے لئے لفظ "سنا" ہے جس کے معنی خالی کے ہیں جب عربوں نے اس طریق کتابت عدد کو اہل ہند سے لیا تو "سنا" کی جگہ اس کا ہم معنی لفظ صفر استعمال کیا۔ عربوں کے ذریعہ جب یہ طریقہ یورپ میں رائج ہوا تو اہل یورپ نے اپنی زبان میں صفر کو بعینہٖ (Cipher) میں تبدیل کر دیا۔ یورپ کی اکثر زبانوں میں یہ لفظ اب بھی مستعمل ہے اور ان ارقام کو "ارقام عربیہ" کہتے ہیں لیکن یہ ارقام عربیہ یورپ میں بجائے عرب سے پہنچنے کے مغرب کی طرف اسپین سے پہونچے عرب اسپین میں مراکش کی طرف سے داخل ہوئے اور ۷۴۶ء میں اسپین میں اپنی حکومت قائم کی دسویں اور گیارہویں صدی میں یہ حکومت اپنے علم و کمال تہذیب و تمدن کے بلند ترین معیار پر تھی۔ اگرچہ اس حکومت کے سیاسی تعلقات خلفائے بغداد کے ساتھ چنداں خوشگوار نہ تھے۔ لیکن انہوں نے یہاں کے علم و کمال کا خیر مقدم نہایت خوشی کیا۔ اور بغداد کے علمائے ریاضی دان کی تصانیف دیگر علوم و فنون کی تصانیف کے ساتھ جلد حاصل کر لیں۔ اس طرح افلاطون، ارسطو، اقلیدس، ارشمیدس، ابولونیس آریہ بھٹہ اور برہم گپتا اور دیگر مصنفین کی تصانیف کے عربی ترجمے مع علمائے عرب کی ریاضی تصانیف کے اندلس پہونچ گئیں۔ اندلس کے عربوں نے جو ارقام ہندیہ بغداد کے علمائے ریاضی سے حاصل کئے اس کا نام "ارقام الغبار" رکھا۔

ذیل میں ہم اُن اعداد کی کتابت درج کرتے ہیں جو آٹھویں صدی کے بعد ہندوستان میں مستعمل تھی۔۔۔ اور بعد میں چنداں ترمیم کے بعد عرب، اندلس، اور مغربی یورپ میں رائج ہوئی۔۔

ارقام ہندیہ ۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۵ و ۶ و ۷ و ۸ و ۹ و ۱۰
ارقام الغبار ۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۵ و ۶ و ۷ و ۸ و ۹ و ۱۰
ارقام اطالیہ 1 2 3 4 5 6 7 8 9 10

یہ ارقام مغربی یورپ میں بارہویں صدی سے قبل نہ پہونچ سکے۔ ابتداء میں زیادہ تر اہل اطالیہ اندلس کے عربوں سے تجارتی تعلقات رکھتے تھے۔ بایں وجہ اول اول یہ اعداد عشری اٹلی میں رائج ہونا شروع ہوئے اطالیہ کے تاجروں نے اپنے کھاتوں کا حساب ان ہی اعداد عربیہ میں لکھنا شروع کیا۔ اندلس کی ہمسایہ عیسائی حکومتیں عربوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھیں۔ وہ ان عربوں کو "مورس" کے نام سے موسوم کرتی تھیں۔ اور ان سے نفرت کرتی تھیں۔ عربوں کے خلاف یہ نفرت کے جذبات اس درجہ بڑھ گئے تھے کہ ان کے علم و کمال سے بھی بیزاری کا اظہار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اطالیہ کے ایک شہر فلارنس میں ۱۲۹۹ء کا ایک شاہی فرمان ملتا ہے جس میں اس امر کی ممانعت کی گئی ہے کہ کوئی تاجر عربی ہندسوں میں اپنے کھاتوں کا حساب نہ رکھے اسی نوعیت کا ایک اعلان پڈوا یونیورسٹی (اٹلی) کے ارباب نظم و نسق کا ملتا ہے جس میں عربی اعداد سے احتراز کی تلقین کی گئی ہے۔

اطالیہ میں ان اعداد کی ترویج کا دوسرا ذریعہ عیسائی اور یہودی طلبا تھے جو اندلس کی جامعات میں حصول تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے ملک کو واپس گئے۔ اس وقت اندلس میں تین تین یونیورسٹیاں غرناطہ، کورڈوا اور سیویل تھیں۔ عیسائی طلبا کو ان جامعات میں پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ یورپین مورخ اس امر کو اندلس کے عربوں کے تعصب پر محمول کرتے ہیں لیکن اگر مذہبی تنگ نظری اس رکاوٹ کا باعث ہوتی تو یہودیوں کو بھی ان جامعات میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ ہوتی۔ مگر ایسا نہ تھا۔ یہودیوں کو ان جامعات میں تعلیم حاصل کرنے کی عام اجازت تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اندلس کی اسلامی حکومت اور یورپ کی عیسائی حکومتوں میں سیاسی تعلقات بہت کشیدہ تھے۔ عیسائی طلبا کو ان جامعات میں شرکت کی اجازت نہ ہونے کا باعث یہی سیاسی کشیدگی تھی۔ کیونکہ اس تعلیم کے درپردہ ان طلبا سے سراغ رسانی نہایت ہی آسانی سے ممکن تھی (Adel hard of Bath)

ایڈل ہرڈ آف باتھ پہلا انگریز راہب تھا جس نے یہ کوشش کی کہ عربوں کے سائنٹیفک علوم و فنون کو اپنی قوم تک پہنچائے یہ راہب تقریباً ۱۱۲۰ئہ میں ایک مسلم کے لباس میں کورڈوا کی یونیورسٹی میں شریک ہوا اور وہاں خفیہ طور پر اس نے اقلیدس، الخوارزمی کے الجبرا اور حساب کی کتابوں کی نقل حاصل کی۔ اس نے تختہ شمار کے استعمال پر بھی ایک کتاب لکھی۔ دوسرا قابل ذکر شخص جس نے عربوں کی ریاضیات کو یورپ میں پھیلانے کی کوشش کی وہ ابراہیم بن ازہر نامی ایک یہودی تھا۔ یہ ۱۰۹۷ء میں ٹولیڈو میں پیدا ہوا۔ اور ۱۱۹۷ء میں روم میں وفات پائی۔ علم ہیئت پر چند تصانیف کے علاوہ اس نے علم الحساب پر ایک کتاب لکھی اور اس میں کامل وضاحت کے ساتھ اعداد عربیہ جس میں صفر بھی شامل ہے بیان کیا ہے۔

تیسرا قابل ذکر شخص جس نے عربوں کے دوسرے علوم و فنون کے ساتھ ارقام عربیہ کو یورپ میں پھیلایا لیونارڈ تھا۔ یہ شخص ۱۱۷۵ئہ میں پیسا (اٹلی) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک تاجر تھا۔ جس کو تجارت کے سلسلہ میں ایک عرصہ تک بغیہ (باربری شمالی افریقہ) میں رہنا پڑا۔ لیونارڈ نے یہیں تعلیم پائی اور اس طرح الخوارزمی کی تصانیف اور ارقام عربیہ سے واقف ہوا۔ وہ تقریباً ۱۲۰۰ئہ میں اٹلی واپس ہوا۔ ۱۲۰۲ئہ میں اس نے الجبرا پر ایک کتاب لکھی جو الخوارزمی کے الجبری اصولوں پر مبنی تھی۔ اس کتاب میں وہ ارقام عربیہ کی تشریح کرتا ہے اس نظام کو رومی طریقہ پر جو فوقیت حاصل ہے اس کو بیان کرتا ہے لیونارڈ لکھتا ہے کہ "چند سال کی کوشش کے بعد اس نے یہ ارقام عربیہ جن کو یورپ کے ارقام پر بلحاظ سہولت خاص فوقیت حاصل ہے باربری میں سیکھا ہے لہذا میں ان کو اس خیال کے تحت شائع کرتا ہوں تاکہ لاطینی قوم اپنے علم میں کسی سے پیچھے نہ رہے"

اس ضمن میں جرمنی کے شہنشاہ فریڈرک دوم کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اس نے ۱۲۱۰ئہ تا ۱۲۵۰ئہ تک حکومت کی یہ علم و کمال کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ اور اس نے عربوں کے علوم کو مغربی یورپ میں پہنچانے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ نیپلیز اور پڈوا میں دو جامعات قائم کیں۔ یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۱۲۲۵ئہ میں جب یہ علم نواز بادشاہ پیسا (اٹلی) سے گذرا تو لیونارڈ کی ریاضیات کی شہرت سنکر

ٹہر گیا۔ اور وہاں ایک ٹورنامنٹ اس غرض سے منعقد کیا تاکہ لیونارڈ کی ریاضیات سے متعلقہ فراست کی جانچ کی جائے لیونارڈ کو اس ٹورنامنٹ میں دیگر علمائے ریاضیات کے ساتھ مدعو کیا گیا۔

مقابلہ کے لئے جو سوالات دئے گئے اُن میں ایک یہ تھا:۔

"ایک ایسا عدد معلوم کرو، جس کے مربع میں ۵ کی زیادتی یا کمی کرنے سے ہر دو صورتوں میں وہ مربع رہتا ہے"

لیونارڈ اس کا جواب $\frac{41}{12}$ دیا۔ جو صحیح تھا۔ اس بادشاہ نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا جس میں اندلس کی جامعات کے فارغ التحصیل یہودیوں کا تقرر اس غرض سے کیا کہ وہ عربوں کے علوم ریاضیات کی کتابوں کا ترجمہ کریں اقلیدس، ارشمیدس، اپولنیس، ٹولمی الخوارزمی کی کتب ریاضیات کا ترجمہ عربی سے لاطینی زبان میں منتقل کیا گیا۔ اور اسطرح چودھویں نصف صدی میں ارقام عشری کا عام استعمال یورپ میں ہوگیا۔ اور پندرہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے تقریباً تمام دنیا میں ان اعداد کا رواج ہوگیا۔

قطعہ تاریخ

انتقال پُرملال عالیجناب نواب سر مسعود جنگ بہادر مغفور

از

حکیم مولوی محمدؐ فاضل صاحب فاضلؔ

راس مسعود ناظم سابق — روئے نیکوئے خود زما چو نہفت

سالِ تاریخ او چو پرسیدم — "زینت دہر رفت" ہاتف گفت

۱۳۵۶ھ

مثالی مدرس

مولوی یوسف الدین صاحب صنابی۔ا مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل

تمہید معاشرہ کے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ دو چیزوں کو اپنا نصب العین بنائے تاکہ اُسی کے ذریعہ سے وہ خود کو معاشرہ کا صحیح معنوں میں کامل فرد ثابت کر سکے۔ ایک تو علم اور دوسرا عمل۔ اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہوں گی لیکن اُس کا علم اُس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ وہ اپنی مقصد معلومات کی وساطت سے عمل کو درست نہ رکھے اور عمل اُس وقت تک ناموزون رہے گا جب تک کہ وہ علم کو وسعت نہ دے۔ اس لئے عمل کے لئے علم لابدی شئے ہے اور علم بغیر بہترین رہنما اور رہبر کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہ علم یا علمی ذوق اُس وقت تک صحیح معنوں میں علمی ذوق کہلانے کا مستحق نہ ہو گا جب تک کہ وہ ایک ہمدرد، مہربان، دوست فلسفی، فرض شناس، خوش مزاج معاملہ فہم، انصاف پسند رہبر کے ذریعہ حاصل نہ کیا جائے وجہ یہ ہے کہ ہمہ صفت موصوف رہبر اگر مل جائے تو ناممکن ہے کہ کسی پہلو سے بھی اُس کی رہبری سے فائدہ اٹھانے والے میں کمی رہ جائے۔ اسی لئے حصولِ علم میں جس چیز کو اولیت حاصل ہونی چاہیئے وہ ایک رہبر یا مدرس کی تلاش ہے مدرس کا پیدائشی ہونا اچھا ہے کیونکہ وہ مدرس جس کو طلباء کے ساتھ ہمدردی ہو گی اور علمی ذوق رہے گا وہ ایک کامیاب مدرس ثابت ہو سکتا ہے بہ نسبت اُس شخص کے جس نے تلاش معاش میں مختلف دروازوں کو کھٹکھٹایا ہو اور سب جگہ سے مایوس ہو کر اس پیشہ کو اختیار کر لیا ہو۔ یہاں ہم فرداً فرداً اُن صفات سے بحث کریں گے جن کا مدرس میں ہونا لازمی ہے۔

مدرس میں جوش اور ولولہ ہونا خدا نے انسان کو جوش اور ولولہ کا جذبہ ودیعت کیا ہے۔ یہ ایسا جذبہ ہے کہ اس سے کام لے کر ہر فرد ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ یا معمولی اور کٹھن کاموں میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

اس لئے مدرس کو بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ اس جذبہ سے کام لے۔ اُس کو جوش اور ولولہ سے کام لے کر خود کو سچا اور محنتی آدمی ثابت کرنا چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک مدرس محنت کا عادی ہوگا، وقت پر کام کرے گا، طلباء کی بروقت رہنمائی کرتا رہے گا تو ظاہر ہے کہ اُس کے جس قدر بھی تلامیذ ہوں گے وہ بھی اسی جذبہ کے تحت محنتی ہوں گے مضمون سے دلچسپی کا اظہار کریں گے اور محنت برداشت کرنے کے عادی ہوں گے برخلاف اس کے اگر کوئی مدرس مفوضہ مضمون کی تعلیم گاہے ماہے دیتا ہو اور اکثر و بیشتر وقت بیکاری میں صرف کرتا ہو تو اُس کا پرتو طلباء پر بھی پڑے گا اور وہ بجائے دلچسپی کا اظہار کرنے اور محنتی ہونے کے بدشوق اور آرام طلب ہو جائیں گے اور اسی بنا پر اونہیں اپنی آئندہ زندگی بارگراں معلوم ہوگی اور وہ کف افسوس ملتے رہ جائیں گے۔

مدرس کا ہمدرد ہونا | بچوں میں یہ ایک فطری عادت ہوتی ہے کہ کسی غیر مانوس بچہ کے ساتھ ملائمت اور نرمی کا برتاؤ کیا جائے تو وہ از خود قریب آجاتا ہے اور غصہ سے دور بھاگ جاتا ہے۔ یہ عادت نہ صرف بچوں بلکہ جانوروں کی بھی ہوتی ہے۔ بچے مثل جانوروں کے ہیں۔ وہ ماں کی گود چھوڑ کر مدرسہ آتے ہیں جہاں پر اُن کے ساتھ محبت اور خالص محبت کا برتاؤ کیا جاتا رہا ہے اس لئے وہ اپنے ماحول کے بدلنے پر بھی خواہاں ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کیا جاتا رہے تاکہ ان کی دلجمعی ہو۔ اگر مدرس طلباء کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آئے تو یہ یقین ہے کہ اگر اُن سے ناقابل برداشت بوجھ بھی اُٹھانے کے لئے کہا جائے تو اُسی شفقت آمیز برتاؤ کی وجہ سے وہ کبھی دریغ نہ کریں گے اور ہمیشہ آمادگی کا اظہار کرتے رہیں گے۔ اس لئے مدرس کو چاہیئے کہ وہ طلباء کے ساتھ ہمدردانہ اور شفقت آمیز برتاؤ کیا کرے جو اُن کے لئے پدرانہ شفقت کا بدل ہو وہ اس پدرانہ شفقت کے ذریعہ اونہیں سب کچھ بتلا دے گا جو کہ طلباء اپنے والدین سے حاصل نہ کر سکے ہوں۔ مدرس کی اس پدرانہ محبت اور ہمدردی کے بعد اگر ضرورت پر وہ طلباء کو سخت ترین سزا بھی دے تو وہ اپنے مشفق مدرس سے کبھی ناراض نہ ہوں گے اس لئے بچوں سے ہمدردی رکھنا مدرس کے لئے ضروری ہے۔

خوش مزاجی | خوش مزاجی بھی منجملہ اُن صفات کے ایک ہے جو فرد کو معاشرہ کا

اہل بناتی ہے جو شخص خوش مزاج ہوگا، چہرہ ہنس مکھ رکھے گا، نیک مشورہ دیا کریگا، سب کے ساتھ یکسانیت سے بلاتخصیص مدارج ملا کریگا، بر موقعہ اعانت سے پہلوتہی نہ کریگا اُس کو معاشرہ کے تمام افراد پسند کرتے اور اُس کے ساتھ راہ و رسم رکھنا باعث فخر سمجھتے ہیں اس لئے مدرس کو چاہیئے کہ وہ طلبار کے ساتھ خوش مزاجی کا اظہار کرے، ہمیشہ ہنس مکھ رہے، کبھی بھی چہرہ سے غم و غصہ کے آثار ہویدا نہ ہونے دے، اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرے، اُن کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہوا کرے تاکہ اُس کے عمدہ خصائل کو دیکھ کر طلبار اپنی کمزوریوں کو دور کرکے اونہیں اختیار کرنے کی کوشش کریں، اُن کے بُرے افعال کا خیال رکھے اور اُن کی اصلاح کی کوشش کرے، اس ذریعہ سے مدرس کی خوش مزاجی طلبار کی سیرت سازی کا کام دیگی۔ قدیم زمانہ میں مدرس طلبار کو اپنے ساتھ رکھکر اونہیں مختلف ذرائع سے تعلیم دیتا اور ان کے اخلاق کو درست کرتا تھا اور ختم تعلیم پر اونہیں اپنی صفات کا کامل نمونہ بناکر چھوڑتا تھا۔ فی زمانہ ایسے مدرسین جن کے تفویض علوم مشرقیہ کا تعلیمی کام ہو وہ قطعاً طلبار کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کرتے۔ اُن کا خیال ہے کہ اس طرح کے اشتراک عمل سے طلبار پر رعب قائم نہیں رہ سکیگا۔ واقعہ یہ ہے کہ خوش مزاجی سے مدرس اور طلباؤں میں دلی لگاؤ اور یگانگت پیدا ہوتی ہے جو طلبار کے لئے مفید نتائج پیدا کرنے کا ذریعہ ہوسکتی ہے

حسن تدبیر اور انصاف پسندی سے کام لینا۔

مدرس کا تعلق کئی سو طلبار سے ہوتا ہے اور ان تمام طلبار سے واقفیت حاصل کرکے اونہیں کافی معلومات بہم پہنچانا اُس کے فرائض میں داخل ہوتا ہے اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ طلبار کی استعداد و قابلیت سے کماحقہ، واقف ہوکر اونہیں اس طرح قابو میں رکھے کہ طلبار میں اُس کے احکام کی خلاف ورزی اور عدول حکمی کا شائبہ تک پیدا نہ ہونے پائے۔ احیاناً اُن سے کوئی غلطی سرزد ہو بھی جائے تو اُس کا سلوک بجائے درشتی اور سختی کے ایسا نیک، ملاطفت آمیز، سنجیدہ اور شریفانہ ہو کہ خاطی از خود پشیمان ہوکر عفو کا طالب ہو جائے لیکن قابو رکھنے کے معنے یہ نہ ہوں گے کہ اُن کے ساتھ سختی کا برتاؤ ہو اور اُس سخت گیری کا خیال کرتے ہوئے خوف کے مارے مدرس کے ہر حکم کو طلبار حکم قضا، تسلیم سمجھکر بلا پس و پیش خاموش رہنے پر مجبور ہوں۔ اسی قسم کا قابو

ظاہر ہے کہ عرصہ تک حاصل نہیں رہ سکتا اور وہ بالکل ہی کھوکھلا اور ناپائیدار ثابت ہوگا۔ اسی وجہ سے ایسے ناخوشگوار تعلقات جو مدرس اور طلبا میں پیدا ہونے کا امکان رکھتے ہیں اُن کی روک تھام کے لئے اور مدرس کی قوت گرفت کو زیادہ پائیدار بنانے کے لئے ضرورت ہے کہ مدرس حسن تدبیر اور حکمت عملی سے کام لیا کرے یعنے حالات اور موقعہ کا لحاظ کرتے ہوئے اُس کو کام کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں چونکہ اُس کا تعلق کئی سو طلبا سے ہوتا ہے اور ان کئی سو طلبا میں ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا ہونا یقینی ہے۔ جب اس قسم کی وارداتیں رونما ہوں گی تو وہ دادخواہی اور فیصلہ کی خاطر مدرسہ کی عدالت میں پیش ہوں گی جس کا واحد اعلیٰ عہدہ دار مدرس کی ذات ہوتی ہے۔ مدرس تمام واقعات کو بغور سُننے کے بعد پیش شدہ واردات کے لئے فوری فیصلہ صادر کردے گا اور اُس کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ صدور فیصلہ کے بعد اسی فیصلہ پر قائم رہے۔ اگر ضروریات مدرسہ کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی قانون نافذ کرے تو اُس کے لئے لازمی ہے کہ نافذ کردہ قانون کے نفاذ کے بعد مستقل مزاجی سے وہ اُسی پر قائم رہے۔

قوتِ مشاہدہ کا ہونا مدرس کو ہر وہ چیز جو اُس کے سامنے آئے اور جس کو کہ وہ اغراضِ تعلیم کے لئے ضروری سمجھتا ہے غور و خوض سے دیکھنا چاہیئے اُس کی ماہیت کو سمجھنا اور اُس سے کس نوعیت کا فائدہ حاصل کر سکے گا نتیجہ نکالنا چاہیئے تاکہ تدریس میں طلبا کو ضروری چیزوں کے مشاہدہ سے تفہیم کرا سکے۔ مثال کے طور پر مطالعہ قدرت کے سبق میں کسی ایک پھول پر سبق دیا جارہا ہو اور دوران سبق میں صرف یہ کہدیا جائے کہ وہ پھول اس شکل کا ہوتا ہے، اُس کی پنکھڑیاں اس وضع کی ہوتی ہیں، پنکھڑیوں کا اگلا رنگ گلابی اور بقیہ سفید وغیرہ تو طلبا اُس پھول کے سبق کو سمجھ تو جائیں گے لیکن اُن کے سامنے اگر وہ پھول کبھی آبھی جائے تو وہ تمیز نہ کر سکیں گے کہ ماسٹر صاحب نے جس پھول کا ذکر کیا تھا وہ یہی ہے۔ اس لئے سبق میں جب تک مشاہدہ سے کام نہ لیا جائے اُس وقت تک نامکمل رہیگا اور جب تک مدرس کو سابقہ واقفیت نہ ہو اُس وقت تک مشاہدہ بیکار ہے۔ اسی وجہ سے مدرس کو نہایت خبردار ہونا، گہرا مشاہدہ کرنا اور ہر چیز پر گہری نظر ڈالنا چاہیئے۔

طلبا پر حکومت میں سختی کا اخفا ہونا۔ تعلیمی انتظامات جو کسی بھی ملک میں

سرانجام پاتے ہیں اُن کی نوعیت بالکل ہی ایک متمدن ملک کی شیرازہ بندی اور انتظامات کی سی ہوتی ہے۔ مثل ایک عہدہ دار کے جو رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنے اُنکو بلوہ و فساد وغیرہ سے روکنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے مدرس کی حیثیت بھی بعینہٖ ویسی ہی ہے مدرس طلباء کا دوست ہوتا ہے، اُن کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا ہے، اُن کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے اونہیں نیک مشورہ دیتا ہے، اونہیں بُری عادتوں اور بُری صحبتوں سے روکتا ہے۔ ان تمام امور کے لئے وہ بحیثیت ایک حاکم کے طلباء پر حکومت کرتا ہے لیکن اُس کی حکومت حکمت عملی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ وہ نرمی اور ملائمت کا برتاؤ کرتا ہے۔ اور کبھی ضرورت لاحق ہو تو سختی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس طرح کی حکومت کو طلباء کبھی ناپسند نہیں کرتے بلکہ اُس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کردینے آمادہ دکھائی دیتے ہیں برخلاف اس کے اگر مدرس ایسا طرز اختیار کرے کہ ہمیشہ طلباء کے ساتھ سختی کرے، اُن کی معمولی سی غلطی پر سخت ترین سزا دیا کرے، اُن کے ناقابل گرفت تساہل پر برافروختہ ہوجایا کرے اور گھُرکی و دُرشتی کے سوائے کام نہ لے تو ظاہر ہے کہ اس فضاء میں جو بھی سبق دیا جائے طلباء بغیر سمجھے ہوئے اوسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ علاوہ ازیں سختی ایک حد تک برداشت کی جاتی ہے۔ جب وہ ناقابل برداشت ہو جائے گی تو طلباء میں انقلابی صورت رونما ہوگی اور وہ مدرس کے خلاف جا و بیجا حرکات جائز رکھیں گے اس لئے مدرس کو طلباء پر حکومت ایسی کرنی چاہئیے کہ جس میں سختی کا پہلو ظاہر نہ ہو۔

موادِ تدریس سے واقفیت

مدرس کے لئے سب سے بڑی چیز موادِ تدریس سے واقفیت ہے۔ کسی مضمون پر جب تعلیم دیجاتی ہے تو مدرس کا اولین فریضہ یہ ہے کہ اُس مضمون سے متعلق کافی معلومات کا ذخیرہ مہیا رکھے کیونکہ اس امر کا امکان ہے کہ دوران سبق میں طلباء اُس سے مختلف سوالات کر بیٹھیں چنانچہ اُن تمام سوالات کے جوابات کے ذریعہ ہی وہ نئے مضمون کو ذہن نشین کرا سکتا ہے۔ اُس کو مختلف طریقوں سے سمجھانا پڑتا ہے۔ سابقہ معلومات سے کام لینا پڑتا ہے۔ عام فہم مثالوں سے وضاحت کرنی پڑتی ہے۔ بہر حال اُس کو ہر ممکن طریقہ سے مضمون کو دلچسپ اور قابل فہم بنانا پڑتا ہے اور اسی لئے اُس کو کافی موادِ تدریس کی ضرورت ہے،

اگر مواد تدریس کافی نہ ہو تو اُس کے معنے یہ ہوں گے کہ سبق کو دلچسپ بنانے اور طلبار کو تفہیم کرانے کی بجائے طلبار کا وہ حصۂ وقت بیکار گیا اور مدرس نے فرائض کی خلاف ورزی کی۔ موادِ تدریس پر عبور اُس وقت تک حاصل نہ ہو سکے گا جب تک کہ مدرس اپنے تعلیمی زمانہ میں مضامین پر عبور حاصل نہ کرتا رہا ہو۔

جماعت میں مدرس اور طلبار کا کام برابر ہو

مدرس طلبار کا رہبر ہوتا ہے اور رہبر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ موقعہ اور مناسبت سے ہدایت کر دیا کرے۔ اس لئے مدرس کو چاہیئے کہ دوران تدریس میں سوالات کے ذریعہ طلبار سے مواد اخذ کرنے کی کوشش کرے اور بہت کم خود کہا کرے۔ مدرس کے کہہ دینے سے طلبار میں جو خود فعلیت کی عادت ہوتی ہے اُس میں ترقی نہیں ہو سکتی اس لئے بعض ماہران تعلیم نے یہ بتلایا ہے کہ مدرس جس قدر کم کہا کرے گا اُسی قدر طلبار غور وفکر سے زیادہ کام لیں گے یا یہ کہ سوالات کے جواب میں جس قدر آواز طلبار کی سنی جائے گی اُسی قدر آواز مدرس کی بھی سنائی دی جانی چاہیئے۔ علاوہ ازیں مدرس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ جماعت میں زیادہ نہ چلّائے یعنے سبق اس انداز سے دے کہ اُس کی آواز تمام طلبار کو عمدگی سے سنائی دے نہ کہ اس طرح پر جس سے طلبار پریشان ہو جائیں اور اُن کے سمجھنے میں تکلف ہو۔ اس طرح پر چلّانے سے نہ صرف اُس کی صحت پر اثر پڑتا ہے بلکہ جماعت کے ڈسپلن میں بھی خرابی واقع ہوتی ہے چلّانے سے نہ صرف آواز، حلق اور قوت جسمانی پر بُرا اثر پڑتا ہے بلکہ اس تکان کی وجہ سے جب وہ زیادہ آواز سے کام لینا چاہے تو نہیں لے سکتا۔

چستی وچالاکی کی ضرورت

فی زمانہ ورزش جسمانی کی تعلیم پر عام طور سے زور دیا جا رہا ہے اور اس رجحان کی وجہ یہ ہے کہ طلبار میں اس ذریعہ سے چستی وچالاکی پیدا کی جائے اور وہ اپنا کام عمدگی سے کریں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ مدرس کے حرکات وسکنات کا اثر طلبار پر زیادہ پڑتا ہے اس لئے مدرس کا طرزِ عمل جماعت میں جیسا بھی ہو گا طلبار اُس کو اختیار کریں گے۔ مدرس اگر جماعت میں تمام وقت کرسی پر بیٹھا رہے، دیوار سے ٹیکا لگائے رہے یا کتب اپنے زانو پر رکھے رہے، دونوں پیر کرسی پر یا میز پر رکھے رہے تو ان حرکات کا اثر جیسا کچھ طلبار پر ہو گا ظاہر ہے

طلبا، چست و چالاک ہونے اور سبق سے دلچسپی کا اظہار کرنے کی بجائے سُست اور لاپرواہ رہنے لگیں گے جس کا کاملاً مدرسہ ذمہ دار ہوگا۔ اس لئے مدرس کو چاہیئے کہ جب تک وہ جماعت میں رہے زیادہ تر دورانِ سبق میں ٹہلتا رہے اور بہت کم وقت کرسی پر بیٹھکر گذارے۔ اس کا اثر طلبا پر یہ ہوگا کہ وہ سبق میں دلچسپی لیں گے، اُن کی توجہ قائم رہے گی اور اُن میں چستی و تیزی پیدا ہوگی۔ اور یہ اُس کے لئے ایسی ہی اہمیت رکھتی ہے جیسے کہ قوتِ گویائی اور لباس کی پاکیزگی لازمی ہیں۔

مدرس کی شخصیت آج کل ہندوستان میں جس چیز کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ وہ مدرس کی شخصیت ہے اور شخصیت کا اظہار دو چیزوں پر ہے ایک تو اچھی عادت اور دوسرے پاکیزہ لباس عادات شخصیت کا جزو اعظم ہیں یعنی مدرس کی عمدہ عادات اُس کی شخصیت کو ممتاز کردیتی ہیں اور وہ ہم جلیسوں اور طلبا میں وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اگر اس کے خلاف ہو تو طلبا اُس کا مضحکہ اُڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ زبان کی لکنت، کیلتے رہنے کی عادت، ہمیشہ کھجانا، پھونکنا، چہرہ بناتے رہنا وغیرہ ایسی عادات ہیں جو بادی النظر میں عمدہ صفات نہیں سمجھی جاتیں اور یہی چیزیں اُس کے شخصی اثر کو گھٹانے کا باعث ہوتی ہیں۔ مدرس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبا کو جو تعلیم دیتا ہے اور جو عادات سکھاتا ہے پہلے خود اُس پر کاربند ہو۔ یہ نہیں کہ طلبا کو پابندی وقت کے متعلق تعلیم دے اور خود دیر سے آئے، شریفانہ حرکات کی تعلیم دے اور خود بدسلوکی سے پیش آئے، تہذیب سکھائے اور بدتہذیبی سے پیش آئے، راست بازی اور ایفائے وعدہ کی تلقین کرے لیکن طرزِ عمل اُس کے خلاف رکھے، محنتی بننے کے لئے کہے لیکن خود سستی کا اظہار کرے یہ تمام چیزیں مدرس کی شخصی وقعت کو کم کردیتی ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خراب آدمی کبھی بہتر مدرس نہیں ہوسکتا۔ شخصیت کا دوسرا جزو پاکیزہ لباس ہے۔ پاکیزگی اور صفائی کا مادّہ اُس کے ہر کام میں نفاست پسندی پیدا کرتا ہے اور مدرس کی یہ عادت طلبا پر اثر پذیر ہوکر اُن میں پاکیزگی، صفائی اور سلیقہ شعاری کا مادّہ پیدا کردیتی ہیں۔

صفائی یا پاکیزہ لباس سے یہ مراد نہیں لی جانی چاہیئے کہ مدرس ہمیشہ فل سوٹ میں رہے یا یورپین لباس ہی پہنا کرے بلکہ جو کچھ بھی لباس وہ پہنے پاک صاف ہو، چہرہ صاف ہو، بال ٹھیک حالت میں ہوں۔ یہی چیزیں ہیں جو مدرس کی ممتاز شخصیت کا باعث ہوتی ہیں۔

فرض شناسی کی ضرورت

دنیا کے اکثر افراد کسی نہ کسی کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور کاروبار ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک انہماک و دلچسپی سے وقت پر کام نہ کیا جائے کامیابی ناممکن ہے بلکہ بجائے نفع کے نقصان کا زیادہ امکان ہے یہی صورت ایک مدرس کے لئے بھی ہے۔ اُس کے لئے سب سے پہلی چیز جس کا کہ احساس لازمی ہونا چاہیئے وہ فرض شناسی اور اپنے پیشہ سے محبت ہے۔ جب تک کہ پیشے سے محبت نہ ہو اُس وقت تک احساس فرض شناسی کی توقع رکھنا بے معنی سی بات ہے۔ محبت اُس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ اُس پیشہ یعنے پیشۂ مدرسی سے متعلق کافی معلومات حاصل نہ کی جائیں۔ مدرس تو ہر پڑھا لکھا بننے کی کوشش کرتا ہے جن میں سے بعض تو سرکاری ملازمت میں داخل ہوکر مدرس کہلائے جاتے ہیں اور بعض خانگی ٹیوشن ہی کے ذریعہ مدرسی کا کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن یہ تمام فی الحقیقت مدرس کہلانے کے مستحق نہیں کیونکہ ان کا کام محض چار پیسوں کی کمائی کی خاطر ہوتا ہے اس لئے حقیقی معنوں میں مدرس وہی ہو سکیگا جو کہ پیشۂ مدرسی کی معلومات اور واقفیت کی غرض سے متعلقہ علوم کا مطالعہ کریگا، اپنے محدود تجربہ کو وسیع کرنے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے ماہران تعلیم کے تجربوں کو پڑھے گا اور مسلسل اپنے پیشہ میں ترقی کرتا رہے گا اپنے پیشہ کے نظری اُصولوں سے واقف ہوکر انہیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح پیشہ سے متعلق معلومات حاصل کرنے اور اُن پر کاربند ہونے کے بعد لازمی مدرس کو اپنے پیشہ سے محبت پیدا ہو جائے گی اور محبت پیدا ہونے کے بعد فرض شناسی کا احساس ہونا لازمی ہے۔ فرض شناس مدرس طلباء کے نفع اور نقصان کا خیال رکھکر کام کرے گا۔ وقت مقررہ پر اسکول پہونچکر اپنا کام شروع کردے گا، وقت کو ضائع اور بیکار نہ ہونے دے گا۔ مدرسہ کے ہر تعلیمی ساعت کا بجا استعمال کرے گا۔ کسی مدرس کے نہ رہنے پر جو فاضل کام اُسے دیا جائے اُس کا صحیح

استعمال کرے گا۔ اوقاتِ مدرسہ کے ختم ہونے پر طلباء کے چال وچلن اور صحت کی برقراری کی خاطر میدان مدرسہ میں اُن کے ساتھ رہکر اُن کی اصلاح کی کوشش کرے گا اور ہر بُری و بھلی چیز سے اونہیں واقف کردے گا۔ اس طرح پر کام کرنیوالا مدرس ایک فرض شناس اور کامیاب مدرس سمجھا جا سکتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کے فرائض کی انجام دہی دس بجے سے ایک بجے تک اور دو بجے سے چار بجے تک ہے اور صرف کلاس روم ہی کو اپنی کوششوں کا مرکز سمجھتے ہیں وہ کبھی بھی اپنے پیشہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

خوشحالی کی ضرورت ہر اُس شخص کے لئے جو پیشۂ مدرسی کو اپنا نصب العین قرار دیا ہو ضروری ہے کہ وہ دنیا کے بکھیڑوں سے خود کو بے نیاز رکھے اور فرائض مفوضہ کی انجام دہی کے لئے آمادہ و تیار رہے یہ نہیں کہ تلاش معاش کی خاطر دنیا کے بکھیڑوں میں پھنسا رہے اور انجام دہی فرائض میں کوتاہی کرے۔ اس کوتاہی اور عدم ادائی فرائض کا نتیجہ نہ صرف اُس کے لئے مُضر ہوگا بلکہ وہ چونکہ افراد قوم کا تربیت کنندہ اور قوم ساز ہوتا ہے اس لحاظ سے وہ بہ الفاظِ دیگر ترقی کنان افرادِ قوم کے راستہ میں بیجا روڑے اٹکانے کا باعث ہوگا۔ اسی بناء پہ مدرس کے لئے لازمی ہے کہ وہ پیشۂ مدرسی کو نصب العین قرار دینے سے پیشتر مالی حالت کو اچھی طرح دیکھ بھال لے۔ اگر پیشہ سے زیادہ مالی فائدہ نہیں ہوتا ہو تو آیا اُس کی مالی حالت باوجود ادنیٰ مشاہرہ پانے کے اُس کو خوش حال زندگی بسر کرنے کی اجازت دیسکتی ہے یا نہیں اگر اثبات میں جواب ملے تو اُس کو اس پیشہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے ورنہ ہوئے سے بھی اس طرف کا رُخ نہ کرے کیونکہ اُس کو گورکھ دہندوں ہی سے فرصت ملنی محال ہوگی تو وہ اس خصوص میں کیا ہاتھ پیر مار سکیگا۔ لیکن عملاً یہ چیز ہندوستان میں مفقود پائی جاتی ہے کیونکہ معاشی حالات یہاں پر ایسے پست ہیں کہ کسبِ معاش سے بے نیاز ہوکر پیشۂ مدرسی اختیار کرنا محال نظر آتا ہے۔

خصوصیات کا نتیجہ اور خاتمہ بہرحال ان مذکورہ صفات کا حامل جو شخص بھی ہو اگر وہ پیشۂ مدرسی اختیار کرے تو وہ صحیح معنوں میں مدرس اور مثالی مدرس کہلایا جا سکیگا۔ ایسا ہی پیشۂ مدرسی اختیار کرنے والا

شخص بطور طالب علم تدریس کی خاطر مطالعہ کرتا رہے گا اور جو کچھ بھی مطالعہ کرے وہ بہت سوچ سمجھکر پڑھے گا۔ علاوہ ازیں وہ جماعت میں جانے سے قبل موادِ تدریس تیار کریگا، جماعت میں طلبار کو انفرادی فائدہ پہونچانے کا خیال رکھے گا اور جماعت کا معقول انتظام کرے گا۔ یہ انتظام اس طرح پر کہ جماعت میں وقت پر پہونچکر حاضری اور اسباق کی ابتداء، واختتام کا لحاظ کرے، مشقی کاپیاں وقت پر لے اور بعد اصلاح واپس کردے، ڈسک، الماری بلاک بورڈ وغیرہ پاک و صاف حالت میں موزوں مقام پر رکھے، طلبار کی صفائی اور صحت کا خیال رکھے، انفرادی طور پر لحاظ رکھے کہ تمام مضامین کے لئے طلبار کے پاس علحدہ علحدہ کاپیاں موجود ہیں یا نہیں؛ طلبار کے استعداد کا لحاظ کرتے ہوئے سبق دے، اطاعت گزار طالب علم کا انتخاب بحیثیت مانیٹر خود کی امداد کے لئے کرے، کمرۂ جماعت میں کافی ہوا اور روشنی کے وسائل پیدا کرے، نشست و برخاست میں طلبار کے (Posture) کا خیال رکھے، وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح انتظامات کرنے کے بعد وہ ملک اور قوم کا بہی خواہ، سچا ہمدرد اور قوم ساز کہلانے کا مستحق ہوگا۔ گویا کہ ایسے مدرس کی صفات کو ہم دوسروں کے سامنے بطور نمونہ پیش کرسکیں گے۔

قطعۂ تاریخ

از

مولوی شیخ محمد صاحب مجتبیٰ ــ مددگار مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ

حیف کہ سر مسعود۔ زدنیا ــــــ کرد بسوی عقبیٰ رحلت

سال وفاتش ہاتف گفت ــــــ مسعود ما رفت بجنت

۱۳۴۶ ف

مدرسہ اور حفظانِ صحت

مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی-اے ڈپ ایڈ (عثمانیہ)

مدرسہ فوقانیہ نامپلی

تعلیم میں صرف لکھائی اور پڑھائی کو پیش نظر رکھنا خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا بچوں کی جسمانی صحت مقدم ہے اور محض تعلیمی اور اخلاقی پہلوؤں کو بنا مطمح نظر بنائے رکھنا ایک ناقابل تلافی بھول ہے کیونکہ یہ حقیقت اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اکثر بچے جو اپنے اندر ایک اچھا دماغ رکھتے ہیں محض بعض خامیوں مثلاً کم فطری، خراب غذا، ناکافی روشنی، خراب نشست وغیرہ کی وجہ سے تعلیم میں پیچھے رہ جاتے ہیں حالانکہ اگر غور کیا جائے تو ان کا ذہنی خارج قسمت ایک اوسط طالب علم سے کسی طرح کم نہ نکلے گا۔ بات یہ ہے کہ ہم لکھائی، پڑھائی پر اس قدر توجہ دیتے ہیں کہ مدرسہ اور صحت جسمانی سے متعلق مختلف امور جیسے کمرۂ جماعت، عمارت مدرسہ، صفائی، ورزش جسمانی، عام امراض، تکان، مدرس کی صحت وغیرہ پر بہت کم نظر رکھتے ہیں حالانکہ ان پر بھی اتنی ہی توجہ دی جانی چاہیئے جتنی کہ تعلیم کے دیگر پہلوؤں پر دی جاتی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ چیزیں مدرسین اور سب سے زیادہ ان لوگوں کی اولین توجہ اور ہمدردی کی محتاج ہیں جن کے ہاتھ مدارس کے نظم ونسق کی باگ ہوتی ہے۔ تاوقتیکہ مدرسہ حفظان صحت سے متعلقہ امور پر اپنی توجہ مرکوز نہ کرے تعلیم سے اچھے نتائج کی توقع کرنا ایک خوشگوار خواب سے زیادہ دلچسپ نہیں۔

ہندوستانی مدارس اس خصوص میں بہت پیچھے ہیں۔ قدیم طرز کے مدارس میں تو اس نکتہ پر غور بھی نہیں کیا جاتا تھا البتہ عہد حاضر کے تعلیمی خیالات کے مدِ نظر بعض جدید طرز کے مدارس میں اس کا خیال رکھا جانے لگا ہے۔ اس عدم توجہی کی ایک اور بڑی وجہ ماحول کی قدامت کہی جا سکتی ہے، اگر ماحول بدلے گا تو مدرسے خود بخود اپنے پرانے ڈگر سے ہٹ کر نیا جنم اختیار کریں گے لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ

مدرسوں کی اصلاح ماحول کو بدل سکتی ہے گویا ایک طرح سے ماحول مدارس کے تابع ہے۔
یوں تو مدرسہ کی حفظانِ صحت سے متعلق بہت سے امور غور طلب اور قابل لحاظ ہیں لیکن اس مختصر سے مضمون میں چند اہم اجزا پر سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۱)

۱۔ عمارتِ مدرسہ حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے عمارت مدرسہ سب سے پہلی چیز ہے جس پر مخصوص توجہ دی جانی چاہیئے کیونکہ اگر ایک دفعہ عمارت خراب بن گئی تو اس کا مضر اثر طالب علموں کی کئی نسلوں پر پڑے گا۔ اس لئے اس کی تعمیر میں حد درجہ احتیاط لازمی ہے۔

عام طور پر عمارت مدرسہ کی تعمیر کے مسئلہ کو انجینیر ہی پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور چند ضروریات کے تحت ایک خاص نقشہ بنا کر عام طور پر تمام مدارس کی تعمیر اس بنیاد پر کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ پہلے تو ہر مدرسہ کی مخصوص ضروریات ہوتی ہیں اور اس کا محل وقوع مختلف ہوتا ہے، ایک ہی نقشہ ہر جگہ کام نہیں دے سکتا۔ دوسرے اس معاملہ میں مدرس اور مدرسہ کے ڈاکٹر کی رائے مقدم ہے ان میں سے ایک تعلیمی اور دوسرا حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈال سکتا ہے۔

مدرسہ کی عمارت بستی سے کسی قدر دور، اونچے اور ہوادار مقام پر ہونی چاہیئے اس کے لئے عام کلیہ یہ ہے کہ "اگر مدرسہ کے پایہ سے بستی کی قریب تر عمارت کی چوٹی تک ایک خط مستقیم کھینچا جائے تو یہ خط افق سے ۳۰° سے زیادہ کا زاویہ نہ بنائے[1]" مدرسہ کی پشت بستی کی طرف ہونی چاہیئے بشرطیکہ اس سے روشنی کی آمد میں رکاوٹ نہ پیدا ہو۔ عمارت کا رخ اس طرح کا ہو کہ کمروں میں زیادہ سے زیادہ دھوپ آسکے کیونکہ سورج کی روشنی نہ صرف بصارت کے لئے ضروری ہے بلکہ بڑی حد تک اچھی مزیل تعدیہ بھی ہے۔ مدرسہ کا سامنے کا رخ زیادہ شاندار ہونے کی ضرورت

---

[1] ملاحظہ ہو (School Hygiene by Shaw)

نہیں۔ ایک منزلہ عمارت بالعموم پسندیدہ ہے۔ ڈاکٹر لنکن کے خیال کے مطابق عمارت زیادہ سے زیادہ دو منزلہ ہو سکتی ہے کیونکہ اگر منزلوں کی تعداد زیادہ ہو تو چڑھنے اترنے سے بچوں پر بیجا بار پڑتا ہے نیز کمسن طلباء پہلی منزل ہی پر رکھے جائیں تو زیادہ مناسب ہے۔ تمام مدرسہ میں سیلو کا فرش ہو تو زیادہ بہتر ہے، اور قسم کے فرش بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ قیمتی ہوں گے بالخصوص ہمارے ملک میں تو سنگ سیلو کا فرش سستا اور مفید ہے۔

مدرسہ کے صحن میں درختوں کی تعداد اور ترتیب کا مسئلہ غور طلب ہے۔ درختوں کی ترتیب اس طرح کی نہ ہو کہ کمرے دھوپ سے محروم ہو جائیں اور نہ یہ تعداد میں اس قدر زیادہ ہوں کہ مدرسہ کی فضا مرطوب ہو جائے۔

۲۔ کمرۂ جماعت حفظانی نقطۂ نظر سے کمرۂ جماعت عمارت مدرسہ کا اہم جزو ہے۔ تعمیر عمارت سے قبل اس سے متعلقہ حفظانی پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیئے تاکہ عمارت بحیثیت مجموعی قوانین صحت کے مطابق بن سکے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل اجزاء قابل غور ہیں:-

ہوا۔ کمرہ کے ابعاد۔ روشنی۔ رنگ، فرنیچر۔ تختۂ سیاہ۔

(۱) سب سے اول اور ضروری چیز یہ ہے کہ کمرے ہوادار ہوں اور اس طرح کا انتظام ہو کہ ہر وقت صاف ستھری اور تازہ ہوا کمروں میں آسکے۔

(۲) کمرہ کے ابعاد یا اُس کی گنجائش سے متعلق ماہران فن تعلیم و تعمیر کا خیال ہے کہ ہر طالب علم کے لئے ۱۵ مربع فٹ جگہ اور ۲۰۰ مکعب فٹ ہوا کا حجم ہو۔ اس لحاظ سے ۴۸ طلباء کی جماعت کے لئے ۳۰ فٹ لمبا، ۲۵ فٹ چوڑا اور ۱۳ فٹ اونچا کمرہ درکار ہے۔ تحتانیہ جماعتوں کے کمرے نسبتاً کشادہ ہوں تاکہ کمسن بچوں کے لئے اچھا ماحول میسر آسکے، ان کی فعلیت متاثر نہ ہو اور اُن کے اعضا کو نشو و نما کا پورا پورا موقع مل سکے۔ لیکن ہر صورت میں اس امر کا خیال رہے کہ طلباء کی تعداد زیادہ نہ ہو ورنہ پیچھے بیٹھنے والے طلباء مدرس کے کام — آلات سائنس، نقشہ جات، توضیحات، گلوب وغیرہ کی پیشکش کردگی — کو دیکھ سکیں گے اور نہ درس سے کماحقہ مستفیض ہو سکیں گے۔

(۳) کمرۂ جماعت میں روشنی کا مسئلہ کئی اعتبار سے مخصوص اہمیت رکھتا ہے روشنی کا انتظام کرتے وقت مختلف موسموں کا لحاظ رکھا جائے مثلاً دیکھا جائے کہ مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں بالخصوص برسات کے موسم میں جبکہ ہفتوں آسمان پر بادل چھائے ہوتے ہیں، آیا کافی روشنی اندر آسکتی ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ ہندوستان میں تو اتنا زیادہ اہم نہیں لیکن سرد ممالک میں جہاں ہفتوں کیا مہینوں آفتاب کے درشن نصیب نہیں ہوتے، بہت پیچیدہ صورت اختیار کرتا ہے۔ تاہم ہمارے ملک میں بھی بلحاظ ضرورت اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے خصوصًا ان صورتوں میں جبکہ مدرسہ کی عمارت ایسی جگہ واقع ہو یا کمروں کا رخ اس طرف کو ہو جدہر سے کافی روشنی نہیں آتی۔ کھڑکیاں کشادہ ہوں اور ان میں چوڑے سطح شیشے لگائے جائیں تو کافی روشنی اندر آسکتی ہے۔ کھڑکیاں اس طرح سے لگائی جائیں کہ روشنی طلباء کی میزوں پر پڑے۔ لیکن روشنی کسی صورت میں بھی سامنے کی طرف یا سیدھے ہاتھ کی جانب سے نہ آئے کیونکہ سامنے سے آنے والی روشنی بصارت پر مضر اثر ڈالتی ہے اور سیدھے ہاتھ کی طرف سے آنے والی روشنی سے لکھتے وقت کاپیوں پر سایہ پڑتا ہے اور جزوی سایہ، بصارت کے لئے مضر ہوتا ہے۔ روشنی اگر بائیں ہاتھ کی طرف سے آئے تو نصف سایہ بھی نہیں پڑتا اور یہ بہت اچھی چیز ہے۔

روشن دان چھت سے قریب لگائے جائیں اس سے ایک تو منعکس روشنی ملے گی اور دوسرے ترویج کے لئے ان کا اوپر ہونا ضروری ہے۔

(۴) کمرۂ جماعت کے دیگر ساز و سامان کے علاوہ دیواروں کا رنگ بھی صحت کے نقطۂ نظر سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دیوار کے رنگ سے متعلق دو اُمور قابل لحاظ ہیں۔

(۱) ایسا رنگ کیا جائے جو نور کو کم سے کم جذب کرے۔

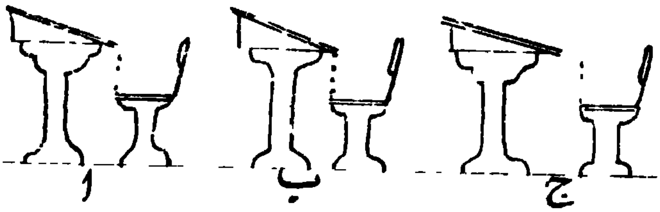
(۲) ایسا رنگ ہو کہ جس سے آنکھوں پر کسی قسم کا بیجا بار نہ پڑے۔

بعض لوگ ہلکے زرد کو پسند کرتے ہیں کہ وہ نور کو بہت کم جذب کرتا ہے۔ لیکن زرد رنگ سے پیدا شدہ احساسات کی نوعیت تکان کا باعث ہوتی ہے۔

اور اس سے ایک طرح کی عصبی کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے آنکھوں کو کوئی خاص ٹھنڈک بھی نہیں پہنچتی۔ سُرخ رنگ تو اس لحاظ سے قطعاً ناموزوں ہے۔

سبز رنگ بہت پسندیدہ ہے۔ قدرت کو بھی یہی رنگ مرغوب ہے! سورج کے طیف (Spectrum) میں بلحاظ تنویر سبز کا درجہ زرد کے بعد ہی ہے اور یہ رنگ بھی شعاعوں کو خاصہ منعکس کرتا ہے، اس سے آنکھوں پر بیجا بار بھی نہیں پڑتا اور بجائے تکان کے فرحت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے سبز رنگ کمرہ کی دیواروں کیلئے بہت موزوں ہے۔

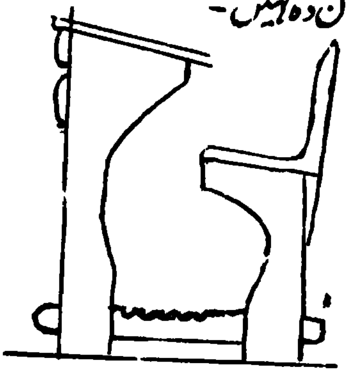
(۵) طلباء کے نشستوں کی ترتیب کمرۂ جماعت میں ایک خاص ماحولی اثر رکھتی ہے نشستیں طول کے محاذی ہوں اور اس طرح ترتیب دی جائیں کہ روشنی پیچھے سے یا بائیں ہاتھ کی طرف سے آئے۔



شکل (۱)

شکل (۱) میں نشستوں کے تین نمونے دئے گئے ہیں۔ ا۔ میں کرسی کا سرا اور میز کا سرا ایک انتصابی خط میں ہیں۔ اسے صفر فاصلہ کہتے ہیں۔ ب۔ میں میز آگے کی طرف بڑھا ہوا ہے یہ منفی فاصلہ ہے اور۔ ج۔ میں میز پیچھے کی طرف ہٹا ہوا ہے یہ مثبت فاصلہ ہے منفی فاصلہ پسندیدہ اور مفید ہے بشرطیکہ آنکھ اور کتاب کے درمیان کم از کم ۱۲" یا ۱۰" انچ کا فاصلہ ہو، مثبت فاصلہ بشرطیکہ زیادہ نہ ہو نقصان دہ نہیں۔

شکل (۲)



یہ کرسی اور میز کا نمونہ ہے ہر دو ترتیب پذیر ہیں طلباء کے نشستی قد کے لحاظ سے اسے ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ ایسی نشستیں وسطی یورپ کے مدارس میں مستعمل ہیں لیکن۔ ان میں خامی صرف

یہ ہے کہ یہ زمین سے بہت اونچی ہیں۔
طلبار کی نشست۔ میز کرسی اور رائٹر کی ترتیب خاص وضع کی ہونی چاہیئے کیونکہ زیادہ تر کام میز پر ہوتا ہے اور نشست کی خرابی سے بصارت خراب ہوتی ہے، تکان زیادہ ہوتی ہے، ریڑھ کی ہڈیاں خم جاتی ہیں، انسان سامنے کی طرف جھک جاتا ہے اور سینہ سکڑتا ہے۔
ہر جماعت کے لئے ایک ہی وضع کی میز اور کرسیاں مناسب نہیں کیونکہ جامعہ ہارورڈ کے پروفیسر باؤڈچ Prof: Bowditch نے ۲۵ ہزار لڑکوں اور لڑکیوں پر تجربہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک ہی عمر کے طلبار کے قدوں میں بین اختلاف ہوتا ہے، نہ صرف یہی بلکہ ان کی نشو ونما کا بھی یہی حال ہے خصوصاً مخلوط جماعتوں میں تو یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شاہ Shaw نے اپنی کتاب اسکول ہائیجین صفحہ (۱۳۸) میں اپنے تجربہ کی بنا پر لکھا ہے کہ "لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی نشستی بلندی، استادہ بلندی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے" ان امور کے لحاظ سے میز اور کرسیاں ترتیب پذیر (Adjustable) ہونی چاہئیں۔ تاکہ وہ اپنے قد کی مناسبت سے ترتیب دے سکیں۔ ساتھ ہی مدرس جماعت ہر وقت طلبار کی نشست پر غور کرے اور مناسب ہدایت دے ورنہ اس زمانہ میں اگر کسی قسم کی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کا اثر دیر پا رہتا ہے (بازو کے صفحہ پر نشستوں کی خاص وضع دی گئی ہیں)
(٦) تختہ سیاہ بالعموم لکڑی کے بنائے جاتے ہیں جنہیں بار بار دھویا نہیں جا سکتا اگر یہ لکڑی کی بجائے سلیٹ کے ہوں تو انہیں وقتاً فوقتاً دھو کر کمرہ کو کھریا کے ذرات سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔
تختہ سیاہ کے لئے مختلف قسم کے رنگ استعمال کئے جاتے ہیں بھورا، خاکستری، سیاہ، سبز۔ لیکن ان میں سوائے سبز کے دوسرا رنگ مناسب نہیں۔ یا تو تختہ سیاہ ہوں یا سبز۔ چاک کی لکھائی سبز تختہ میں اس طرح واضح ہوتی ہے جس طرح سیاہ پر۔ اگر دیوار پر مناسب موٹائی کا موٹا کاغذ لگا کر اس پر گہرا سبز رنگ کر دیا جائے تو مناسب اور بہتر ہے۔ تختہ سیاہ کی چوڑائی چار فٹ ہونی چاہیئے۔

اور اسے فرش سے ۳۰ انچ کی بلندی پر رکھنا چاہیئے تختہ سیاہ کے نیچے نالی کی سی جگہ بنائی جائے تاکہ چاک کا سفوف وہیں جمع ہو اور کمرہ میں پھیل کر سانس کے ذریعہ طلبا کے جسم میں داخل نہ ہو۔

تختہ سیاہ ایسے مقام پر رکھا جائے کہ طلبا اسپر کا کام آسانی سے دیکھ سکیں۔ بعض دفعہ تختہ سیاہ روشنی سے چمکتے ہیں اور بعض طلبا ئے اسے دیکھ نہیں سکتے۔ اسے رکھتے وقت مدرس کو ہر طرف سے دیکھکر اس کا اطمینان کر لینا چاہیئے۔ اگر نیچے اوپر حرکت کرنے والے تختہ سیاہ ہوں تو یہ مشکل بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے۔ گو اس کے لئے کچھ اخراجات زائد عائد ہوں گے لیکن اس سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ کئی گنا زیادہ ہے۔

مسائل صفائی حفظان صحت کے نقطہ نظر سے مدرسہ کی روزینہ صفائی ضروری اور مقدم ہے۔ ہر روز بعد برخاست مدرسہ صفائی کرائی جانی چاہیئے۔ اگر مدرسہ کے موازنہ میں صفائی کا کافی عملہ رکھنے کی گنجائش نہ ہو تو دیگر مدات گھٹا کر اس کے لئے ضروری گنجائش نکالنی چاہیئے۔ روزانہ صرف سرسری صفائی کافی ہے، البتہ ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ گیلے کپڑے سے فرنیچر صاف کیا جائے اور تختہ سیاہ دھویا جائے۔ دیواروں کا رنگ مدہم پڑجائے تو مکرران پر رنگ کیا جائے اگر دیواریں سفید ہوں تو سال میں دو مرتبہ یعنی سرما اور گرما کی چھٹیوں میں آہک پاشی کرائی جائے۔ مدرسہ کا فرش مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور دھلوانا چاہیئے بالخصوص بارش کے موسم میں فرش بہت خراب ہو جاتا ہے، ہر جماعت کے داخلہ کے دروازے میں پائیدان بچھاوئے جائے تو فرش بہت کچھ صاف رہ سکتا ہے۔

باوجود روزانہ صاف کرنے کے میزوں اور بنچوں پر کچھ نہ کچھ گرد آہستہ آہستہ جمتی رہتی ہے۔ اسے صاف کرنے کے لئے بعض لوگ سال میں ایک مرتبہ صابن اور پانی سے دھوتے ہیں لیکن اس عمل سے دارنش اڑجاتی ہے۔ اگر اس کی بجائے مٹی کے تیل میں ترکئے ہوئے کپڑے سے صاف کیا جائے تو بہتر ہے۔

متعدی امراض کی اشاعت کے زمانہ میں تمام مدرسہ کی اچھی طرح سے صفائی کرانا ضروری ہے۔ اکثر مدارس میں محض لاپروائی اور وقتی گڑبڑ کے لحاظ سے تساہل برتا

جاتا ہے جو کسی قیمت پر بھی قابل نظر انداز نہیں۔ اس خصوص میں متعلقہ عہدہ داروں کی نگرانی ضروری ہے۔ جہاں وہ اور تعلیمی معاملات سے دلچسپی لیتے ہیں انہیں حفظان صحت کے معاملہ میں کسی قسم کی بے توجہی برتنی نہیں چاہیئے۔

بیت الخلاء اور پیشاب خانوں کی صفائی، صفائی مدرسہ کا ایک اہم جزو ہے۔ بیت الخلاء مدرسہ کی اصل عمارت سے دور ہوں، ہوادار ہوں اور ان کا محل وقوع اس طرح کا ہو کہ ان سے آنے والی ہوا مدرسہ کے کمروں کو متاثر و متعفن نہ کرے۔ انہیں روزآنہ دو مرتبہ صاف کروا کر فینائیل چھڑکوایا جائے۔ پیشاب خانوں میں مسلسل پانی بہتا رہے شہروں کے مدارس میں فلش استعمال کئے جائیں ورنہ عام طور پر اگر بیت الخلاء میں چینی کا فرش ہو تو مناسب ہے۔ بیت الخلاء اور پیشاب خانوں کے درمیان سایہ بانی راستہ ہو تو بارش کے زمانہ میں بچے تکلیف سے محفوظ رہیں گے۔

بیت الخلاء اور پیشاب خانوں کا روزانہ معائنہ صدر مدرس کا اولیں فرض ہے۔ اس سے ذری غفلت برتنا مدرسہ کی عام صحت کے لئے خطرناک ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور تیسری چیز آب نوشی کا انتظام ہے، پانی پینے کے گلاس عموماً امراض کی اشاعت اور منتقلی کا باعث ہوتے ہیں اور اس سے عام طور پر غدود پھولتے، حلق کے امراض پیدا ہوتے اور دانتوں کے امراض پھیلتے ہیں۔ اگر گلاسوں کو ہمیشہ بہتے پانی میں رکھا جائے تو ان امراض کی بہت کچھ روک تھام ہو جاتی ہے۔ بعض ممالک میں پانی کے فوارے بھی مدرسہ میں لگائے جاتے ہیں جو اس مطلب کے لئے بہت مفید ہیں۔

اس سلسلہ میں بچوں کے منہ ہاتھ دھونے کا بھی خاص انتظام ہونا چاہیئے۔ بالخصوص جب بچے ڈرل سے فارغ ہوں یا کام سے تھک گئے ہوں، تو اس وقت منہ دھونا تازگی کا باعث ہوتا ہے۔ مدارس میں اس مقصد کے لئے مخصوص کمروں میں اس کا انتظام کیا جائے نیز اس امر کی نگرانی رکھی جائے کہ طلباء ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد بالالتزام منہ ہاتھ دھو کر جماعت میں آیا کریں۔

(۳)

مدرسہ اور حفظان صحت کے تعلق کے سلسلہ میں نہ صرف عمارت مدرسہ، کمرۂ جماعت

اور صفائی کے مسائل ہی آتے ہیں بلکہ طلبا کے دماغی کام، ان کا طبی معائنہ، ان سے متعلقہ امراض اور مدرسہ کی صحت وغیرہ کے مسائل بھی معرض بحث میں آتے ہیں جن کے بغیر اس مسئلہ پر پوری پوری روشنی نہیں پڑتی۔

دماغی کام

طبی نقطہ نظر سے یہ ثابت ہے کہ اگر دماغی کام ایک خاص حد سے زیادہ کیا جائے تو اس سے نہ صرف ذہنی قویٰ کی نشو و نما پر مضر اثر پڑتا ہے بلکہ نظام عصبی اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ پھر سے اسے اپنی فعلیت کا معیار حاصل کرنے عرصہ لگتا ہے، شدید ضرورتوں میں تو اس کے نشو و نما کی اہلیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر تکان محسوس ہونے کے بعد بھی کام کیا جائے تو صلاحیت کار اور اکتساب کی شرح گھٹ جاتی ہے۔ اس موضوع پر ابتداء میں ۱۸۹۱ء میں سرکورا سکی Sir korsky اور برگسٹائین Burgestein نے مدرسہ کے پانچ گھنٹوں کے کام کی نوعیت اور اس سے پیدا ہونے والی تکان پر تحقیقات کر کے چند نتائج شائع کئے تھے لیکن ذہنی تکان ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اس پر محض دو آدمیوں کی تحقیقات پر بھروسہ کر کے کلیات قائم نہیں کئے جا سکتے۔ تاہم ان سے جو عام نتیجے حاصل ہوئے ہیں وہ قابل قبول ہیں۔ حال کے نفسیات دانوں نے بھی اس موضوع پر تحقیق کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مختلف مضامین کے اکتساب کے لئے مختلف توانائی درکار ہے اور مختلف انسانوں میں توانائی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں پس ہمیں دوران تعلیم میں ان کی توانائی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ تدریسی مضامین کے انتخاب اور مواد کا احضار اس طرح کا ہو کہ بچوں میں کم سے کم تکان پیدا ہو مثلاً ایسا مضمون نہ پڑھایا جائے جو بچہ کے لئے ناقابل فہم ہو یا کسی مضمون کو قبل از وقت شروع نہ کیا جائے۔ ہر دو صورتوں میں تکان پیدا ہوگی اور تعلیم کا نتیجہ صفر۔

تکان کے مسئلہ کا ایک اچھا اور مناسب حل مدرسہ کے نظام الاوقات کی تنظیم ہے۔ اگر ایک ہی قسم کے ذہنی کام میں تسلسل رکھا جائے اور نوعیت نہ بدلی جائے تو تکان پیدا ہوگی۔ سب سے مشکل مضمون اس وقت لیا جائے جبکہ بچے تازہ دم ہوں۔ اس خیال کی بناء پر ریاضی کو اولیت دی گئی ہے اور دوسرے مضامین کو ان کی اضافی مشکل کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ نظم و نسق مدرسہ کے اعتبار سے یہ مسئلہ

ان مدارس میں بظاہر مشکل نظر آتا ہے جہاں مخصوص مضامین کے مدرسین ہوتے ہیں۔ تاہم صدر مدرس یا نظام الاوقات مرتب کرنے والے دو تین مشکل مضامین کو پہلے اور دوسرے گھنٹے میں رکھکر اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں کیونکہ طلبار ابتدائی دو گھنٹوں میں تازہ دم ہی ہوتے ہیں۔ اس کا ایک حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر مشکل مضمون کے بعد ایک آسان مضمون اس طرح کار کھدیا جائے کہ جس سے طلبار کے دماغوں پر بار نہ پڑے مثلاً ڈرائنگ، نقشہ کشی وغیرہ تو اس سے بچوں میں پھر سے تازگی آجائے گی اور وہ مشکل کام کرنے تیار ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ورزش جسمانی (ڈرل) یا جمناسٹک کے گھنٹہ کو آرام کا گھنٹہ تصور کرنا غلطی ہے۔ مسلسل دماغی کام کے بعد ڈرل کرانا غیر اصولی ہے۔

مسلسل خواندگی اور مسلسل نشست بھی تکان کا باعث ہوتی ہے۔ ہمارے مدارس میں صرف ایک ہی وقفہ دیا جاتا ہے لیکن اصولاً کم از کم ہر دو گھنٹہ کے بعد ۱۰ منٹ کا وقفہ ضروری ہے خصوصاً چھوٹی جماعتوں میں اس کی شدید ضرورت ہے۔

عام طور پر تحتانیہ، وسطانیہ اور فوقانیہ جماعتوں کے گھنٹے (Periods) یکساں طوالت کے ہوتے ہیں۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ جماعتوں کی نوعیت اور طلبار کی عمروں کے لحاظ سے گھنٹوں کی طوالت میں مناسب فرق ہونا چاہیئے۔ چھوٹی جماعتوں میں ۱۰ تا ۲۰ منٹ، وسطانیہ میں ۲۰ تا ۲۵ منٹ اور فوقانیہ میں ۳۰ تا ۴۵ منٹ کا گھنٹہ ہو لیکن فوقانیہ جماعت میں بھی ۴۵ منٹ سے زیادہ کا گھنٹہ بیزارگی کا باعث ہوگا۔

ہوم ورک کا مسئلہ بھی تکان سے متعلق ہے۔ ہوم ورک میں اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ اس میں زیادہ تر دستی اور دلچسپ کام ہو ورنہ محض کاپیاں بھرنے یا معائنہ کنندہ افسر پر اپنے کام کا اثر ڈالنے کے لئے طلبار کو اتنا کام دیدینا کہ ان کے نازک دماغ اس کے متحمل نہ ہو سکیں ایک تعلیمی اور اصولی غلطی ہے۔

امتحانات میں بھی تکان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ روزآنہ دو پرچے کبھی اچھے نتائج برآمد نہیں کرسکتے اور نہ یہ جانچ کا اچھا طریقہ ہے۔ بلکہ روزآنہ ایک پرچہ ہونا چاہیئے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کبھی میں نے اپنا پرچہ (سائنس) صبح میں دیا نتائج کا اوسط اچھا نکلا اور اسی جماعت کو اس معیار کا پرچہ دوپہر میں دیا گیا تو اوسط گرا ہوا تھا۔

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ دن میں دو پرچے دینے سے گویا ہم طلبار کی تکان کے مخالف مدافعانہ قوت کی آزمائش کرتے ہیں نہ کہ اکتساب کی جانچ۔

طبی معائنہ ایک اور اہم اور ضروری چیز طلبار کا طبی معائنہ ہے۔ مدرسہ ایک ایسا مقام ہے جہاں ہر طبقہ اور تقریباً ہر محلے کے طالب علم جمع ہوتے ہیں۔ اور پانچ گھنٹے تک مل جلکر رہتے ہیں۔ ایسے مراکز بعض اشاعت پذیر اور متعدی امراض کے مولید ہیں۔ اور ایک مریض سے نہ صرف طلبار کی خاصی تعداد متاثر ہوتی ہے بلکہ اس کا اثر شہر یا بستی کے مختلف حلقوں پر پڑتا ہے۔ اسی لئے مدارس میں طلبار کی صحت کی کافی نگہداشت کی جانی چاہیئے۔ اگر کوئی طالب علم مسلسل چار آٹھ روز مدرسہ سے غیر حاضر رہے تو اس کا طبی معائنہ ہوجانا ضروری ہے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ایسے مرض سے متاثر ہو جس کی خود اسے خبر نہ ہو(اکثر امراض ایسے ہیں جو بظاہر معلوم نہیں ہوتے لیکن ان کے اثرات مہلک صورت اختیار کرتے ہیں ۔

اس کے علاوہ سال میں کم از کم دو مرتبہ تفصیلی طبی معائنہ ہونا چاہیئے۔ عام طور پر جو طبی معائنہ ہوتا ہے وہ اتنا سرسری ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت تکمیل ضابطہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس طرح کے معائنہ سے ڈاکٹر مخصوص امراض یا خامیوں کا پتہ لگا نہیں سکتے۔ معائنہ کے وقت مدرس اور طلبار کے والدین کی موجودگی ضروری ہے مدرس طالب علم کی تدریسی خامیوں کو ظاہر کرے گا اور والدین طالب علموں کی سابقہ صحت پر روشنی ڈال سکیں گے۔ اس طرح سے ڈاکٹر کی اچھی رہبری ہوسکیگی اور وہ کم وقت میں صحیح نتیجہ پر پہنچ سکے گا۔ معائنہ کے وقت راز اور تنہائی کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اکثر طالب علم مجمع عام میں اپنی خامیاں بتلانے سے شرماتے ہیں۔

یہ بات تسلیم کی جاچکی ہے کہ بچہ کی تعلیمی کمزوری کا سبب محض اس کی دماغی کمزوری یا پس افتادگی نہیں بلکہ صحت کی خرابی، غذا کی کمی اور عصبی تکان بھی اس کے مخصوص اسباب ہیں۔ مناسب طبی علاج سے پس افتادہ لڑکے بھی ذہین طلبا کی فہرست میں جگہ پاسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی طبی معائنہ ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

مدرس سائنس اور اسکوٹ ماسٹر کے زیر نگرانی ہر مدرسہ میں ایک چھوٹا سا دواخانہ ہونا ضروری ہے۔ اگر ہر دو کو تھوڑی سی طبی ٹریننگ دی جائے تو وہ بچوں کی بہت کچھ

مدد کر سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں ابتدائی طبی امداد (First Aid) کا کام سکھلانے کی جو تجاویز ہو رہی ہیں ان میں اگر مدرسین کے لئے کسی قدر زیادہ نصاب رکھا جائے تو مقصد پورا ہو سکتا ہے یا اگر ٹریننگ کالج میں اس کو اختیاری مضمون کی طرح شامل کیا جائے تو میرے خیال اکثر مدرسین سائنس اسے بخوشی پڑھیں گے۔

مدرس کی صحت گو آخری ہی! لیکن سب سے زیادہ ضروری مدرس اور اس کی صحت کا مسئلہ ہے۔ مدرس تعلیمی مشینری کا روح رواں ہوتا ہے اور وہی سارے کام کی کنجی ہے۔ اس لئے مدرس کے انتخاب میں اس کی عام صحت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر وہ مریض ہو یا اس میں کسی قسم کی خامی ہو تو اسے پیشۂ مدرسی کے لئے منتخب نہ کیا جائے۔ وجاہت اور شخصیت اس پیشہ کے لئے اہم صفات ہیں۔ جیمس کر (James Kerr) نے اپنی کتاب اسکول ہائیجین میں لکھا ہے کہ "بچہ کے مستقبل پر مدرس کے اخلاق اور وجاہت اور ہم عمر ساتھیوں کا اثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ کوئی مضمون اس کے برابر اثر پذیری نہیں رکھتا"

مدرس کو اس کی حیثیت کے موافق دلچسپ کام دیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ عدم دلچسپی اور زائد کام (Over - work) کی وجہ سے اس کی صحت خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ جن مدرسین کے ذمہ ضرورت سے زیادہ کام ہوتا ہے ان میں حافظہ کی کمزوری، انہضامی طاقت کا فقدان، دھڑکہ، بالوں کا جھڑنا، درد سر، سستی یا تکان وغیرہ کی شکائتیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ بہت جلد بیکار ہو جاتے ہیں۔

عہدہ داروں کا بیجا برتاؤ بھی مدرسین کے نفس کو بری طرح متاثر کرتا ہے کیونکہ بعض مدرسین اس قدر حساس ہوتے ہیں کہ عہدہ داروں کے ناجائز دباؤ اور ناقدری کے باعث، ان میں کام کرنے کی جو امنگ اور جوش ہوتا ہے، پامال ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ کام کا بار زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے مدرس کے کام کی ہمت افزائی کی جانی چاہیئے اور اسے ایسے مواقع دینے چاہئیں کہ وہ کام کو مجبور ہو کر نہیں بلکہ دلچسپی سے کرے۔

بڑی جماعتوں میں چیخنے چلانے اور مسلسل پڑھانے سے بھی مدرس کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ جماعتوں میں طلباء کی تعداد معین کر دینے اور نظام الاوقات میں کام کی نوعیت کے لحاظ سے مدرس کو کام دینے سے یہ مشکل دور ہو سکتی ہے۔ بہر حال مدرس کی صحت بھی ایک مخصوص اہمیت رکھتی ہے۔

مُدرِس کی شخصیت

مولوی لیاقت علیخاں صاحب۔ مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ

استاد کی شخصیت کے متعلق ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیمی مسائل میں اُستاد کی شخصیت بہت زیادہ ذمہ دار گردانی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مسٹر ولیم چینڈلر بیگلے نے جو ریاست اربانا (متحدہ امریکہ) کے مشہور ماہر تعلیم مصنف ہیں اس خیال کو یوں ظاہر کیا ہے:۔

" بلاشبہ تعلیمی مسائل کے بعض مباحث میں استاد کی شخصیت تمام معائب و محاسن کا سرچشمہ تسلیم کی جاتی ہے۔ ضبط کی کامیابی یا ناکامی میں اس کو بالیقین بڑا دخل ہے"۔

اس کے علاوہ ذیل کے حقائق بھی استاد کی شخصیت کی اہمیت پر تیز روشنی ڈالتے ہیں:۔

گو موجودہ نظریہ تعلیم کے لحاظ سے معلم کو۔ طلباء کے بجائے کام کرنے کے بار سے سبکدوش کر دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے کئی گنی زیادہ ذمہ داری عائد حال کر دی گئی ہے۔ یعنی استاد کا یہ فریضہ ہوگیا ہے کہ طلباء میں اعتماد ذات۔ محنت اور حوصلے کی صفات اس طرح اُجاگر کر دے کہ طلباء میں اپنی مشکلات آپ حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ظاہر ہے کہ طلباء میں یہ حالت خود بخود پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ استاد کی رہنمائی شامل حال نہ ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جہاں نصاب اور طریقہ ہائے تعلیم ایسے لچکدار وضع ہو رہے ہیں وہیں یہ سب کوششیں یقیناً اکارت ہونگی۔ اگر زیادہ متنوع الصفات تعلیمی۔ معاشری۔ اخلاقی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والے معلم کی رہنمائی مہیا نہ کی جائے۔

معلم کی طلباء کے مقابلے میں کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟ ایک سوال ہے جس کا بھی اہمیت شخصیت کی وضاحت کے لئے جواب دیا جانا ضروری ہے۔

یہی ایک واقعہ کہ خود معاشرہ طلباء کے مقابلے میں معلم کو ایک برتر حیثیت عطا کرتا ہے۔ اس سوال کا ایک معقول جواب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سماج کے نزدیک

معلم کا عزت و اقتدار مانا ہوا ہے۔ جس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے نونہالوں کو اسی کے علم و اخلاق اور کردار کے سایہ پروان چڑھنے کی غرض سے اس کے سپرد کردیتا ہے سماج کا عطا کردہ یہ اعتماد استاد کی حیثیت کو روز روشن کی طرح ثابت کررہا ہے۔

اس کے قطع نظر خود طلبا، کو تعلیم کے مقابل رکھ کر پرکھئے تو استاد کی حیثیت طلبار کے مقابلے میں اس سے کئی گنی زیادہ وقیع نظر آئے گی۔

ملاحظہ ہو۔ کون انکار کرتا ہے کہ طلبار میں تقلید کا مادہ ہوتا ہے۔ انہوں نے بنئے کو اناج تولتے دیکھا۔ نیبو کے چھلکوں کی ترازو بنائی۔ مٹی کی ڈھیریاں لگائیں۔ خود کچھ جتیوں اور کاغذوں کے ساتھ چشم بد دور اچھے خاصے ساہو جی بن بیٹھے ٹرین کا انتظام دیکھا۔ اور ادھر دیا سلائی کی ڈبیوں کو آگے پیچھے ٹھیک کرکے اچھا خاصا مٹیرگیج اسٹیشن بنالیا۔ ٹکٹ کی خرید و فروخت بھی ہو رہی ہے۔ بے تنخواہ ٹکٹ کلکٹر اور دیگر ملازمین ریلوے بھی آن موجود ہوئے بغیر دھویں۔ بھاپ کوئلے کے گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آن واحد میں بمبئی۔ پونا۔ کلکتہ۔ دہلی خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گئی!

غرض غور کیا جائے تو سینکڑوں ہی قسم کے ایسے مشغلے ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں جن کے متعلق بجز اس کے کوئی رائے نہیں قائم کیجا سکتی کہ یہ فقط ان "بزرگوں" کی تقلیدی جبلت کا نتیجہ ہے اور بس۔

بہرحال یہ ماننا پڑتا ہے کہ استاد کو ابتداً ایک ایسی ننھی مخلوق سے سابقہ پڑتا ہے جنھیں تقلیدی جبلت نچلا بیٹھنے نہیں دیتی۔ لہٰذا ان حالات کے تحت اس واقعہ سے انکار کی گنجائش نہ ہو سکیگی کہ استاد کی حیثیت طلبار کے مقابلے میں ایسی نازک ہوتی ہے کہ وہ طلبار کی زندگی کے صرف کسی خاص پہلو ہی کو نہیں بلکہ تمام شعبوں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کی مجموعی سیرت سازی کے لئے بیتابانہ کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے یہ بالکل امر واقعہ ہے کہ طلبار پر معلم کے فلسفۂ زندگی طرز عمل اور شخصیت کا بلا واسطہ اثر ہوتا رہتا ہے۔ گویا طلبار کے سامنے معلم شیش محل کے عین وسط میں ٹھیک اس منور شمع کے مماثل ہے جو اپنی پُر تنویر شعاعوں سے گرد وپیش کے ہر آئینہ کو جو اس کی پہنچ کے اندر ہے جگمگا رہی ہو!

کم سن بچوں کے قطع نظر نوجوان طلبا، کی حالت پر بھی غور فرمایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانوں کی یہ مسلمہ نفسیات ہے کہ جس تناسب سے وہ تحکم او ردباؤ سے چراغ پا ہوتے ہیں اسی تناسب سے شخصیت کے قدرتی اثر کو خاموشی خوشی اور سرعت سے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ آپ کا ہمارا مشاہدہ ہے کہ قابلیت۔ تہذیب اور مرتبے میں فوقیت رکھنے والے ہستیوں کی۔ بشرطیکہ ان فوقیت والی ہستیوں کو ان نوجوانوں سے محبت بھی ہو۔ وہ رفتار، گفتار۔ کردار اور اطوار میں تقلید کرتے ہوئے عقیدت اور وفاداری کے ساتھ اُن کے ایسے پیرو بن جاتے ہیں کہ ان کی ناراضی کو بہت بڑی سزا اور خوشنودی کو بہت بڑا انعام سمجھنے لگتے ہیں۔

پس۔ جب ایسا ہے کہ معلم اپنی طرز زندگی کا ہر وقت اپنے طلباء پر کیا کم سن اور کیا نوجوان علی التویہ معلوم اور نامعلوم طریقوں سے اثر ڈالتا رہتا ہے۔ تو لامحالہ اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ ضرورت اور قطعی ضرورت ہے کہ اُستاد اپنے مزاج طرز عمل عادت کے معاملے میں ہر وقت محتاط رہے۔ نیز یہ کہ اپنے اخلاق کو پاکیزہ بنائے اور شخصیت کی تربیت کرے اور اس طرح اپنی ذات کو ان تمام خوبیوں کا زندہ نمونہ بنا کر دکھائے جن کی وہ تلقین کرتا ہے۔ اس کے بعد توقع ہے کہ مدرسہ کے انتظامی معاملات ضبط و تادیب کے مسائل خود بخود سلجھ جائیں گے۔

شخصیت کی اہمیت آپ کے روبرو واضح کر چکنے کے بعد اب میرے لئے ضروری ہے کہ خود اصل شخصیت کی طرف رجوع کروں لیکن ساتھ ہی یہ گذارش ہے کہ شخصیت کا مسئلہ کیمسٹری کے عناصر آکسیجن یا ہائیڈروجن کی طرح کوئی شئے مفرد نہیں۔ اس لئے ایک ایسی مبہم چیز پر وقت واحد میں بحث شروع کرنی تشنگی مضمون کا ہم معنی ہوگا۔ اس لئے میں کوشش کرونگا کہ اولاً شخصیت کا تجزیہ پیش کروں۔

اس غرض کے لئے بجائے اس کے کہ میں خود اپنی دماغی کاوش کا کوئی ناقص تجزیہ پیش کر کے محنت اور وقت دونوں رائگاں کروں مناسب ہے کہ ریاست متحدہ امریکہ کی یونیورسٹی Illinois کے مشہور محقق مسٹر آف۔ ال۔ کلیپ F. L. Glapp کی دلچسپ تشریحات اس خصوص میں پیش کردوں۔

موصوف نے اس خصوص میں عالمانہ دلچسپ انکشافات فرمائے ہیں جن کا خلاصہ

یہ ہے :-

موصوف نے اوّلاً اس مسئلہ کے حل کرنے کے لئے کہ موزوں اور ناموزوں تعلیمی شخصیتوں کے عناصر کیا ہو سکتے ہیں۔ کوئی سو ہتمماں اور پرنسپلز سے حسب مشورہ صاحبان مذکور اُن دس خصائص کی الگ الگ فہرستیں حاصل کیں جو ایک اچھی شخصیت کی صورت گری کا باعث ہوتی ہیں۔

ان جوابات کو جب جانچا گیا تو بقول جتنے منہ اتنی باتیں۔ موصوف کا بیان ہے کہ تقریباً کوئی اعلیٰ خصلت ایسی نہیں رہ گئی تھی جو ان سو فہرستوں میں کسی نہ کسی موقعہ پر جگہ نہ پائی ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ تقریباً دس خصائص ایسی ملیں جنھیں فہرستوں کی ایک کثیر تعداد میں جگہ ملی ہوئی تھی۔ یہ دس خصائص اپنی اکثریت رائے کے لحاظ سے یہ ہیں:-

(۱) ہمدردی	Sympathy
(۲) شخصی وجاہت	Personal appearance
(۳) طرز تقریر	Address
(۴) خلوص	Sincerity
(۵) رجائیت	Optimism
(۶) جوش وخروش یا سرگرمی عمل	Enthusiasm
(۷) علمیت	Scholarship
(۸) قوت حیوانی	Vitality
(۹) راستبازی	Fairness
(۱۰) وقار	Reserve or dignity

شخصیت کے متعلق مذکورہ بالا نتیجہ گو معنی خیز ضرور ہے لیکن ساتھ ہی بمشکل قابل اعتبار بھی اس لئے کہ یہ ہمارا آئے دن کا تجربہ ہے کہ انتخاب کنندہ تعلیماتی افسر اساتذہ کے انتخابی مرحلہ میں بہ یک نظر یہ دیکھتے ہیں کہ ملازمت خواہ کے اسناد تعلیمی فرائض کی تشفی کرسکتی ہیں یا نہیں۔ گویا ان کا یہ خیال اس خصوص میں مروجہ General Impression "یا عام تاثر" کا نتیجہ ہے۔ جس کی کامیابی کا تجربہ شاہد ہے۔

اب یہاں اس حقیقت کے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت دینا چاہیئے کہ اگر افسران

تعلیمات کے اس عام اصول عمل کو بالکلیہ خیر باد کہہ دیا جائے اور اس کی بجائے اساتذہ کے انتخابی مسئلہ کے لئے اساتذہ فن کی مذکورہ ذاتی رایوں کے پیش کردہ ملخص ہی کو معیار انتخاب قرار دے لیا جائے تو کامیاب استاد کا انتخاب اس معیار کے تحت شاید ایک ایسا مسئلہ ہو جائے جس کی یقینی اور حتمی ضمانت نہ دی جا سکے۔ اس لئے کہ جہاں مسٹر کلیپ خود اپنے اس اخذ کردہ نتیجہ کو اس خصوص میں غنی خیز تسلیم کرتے ہیں وہاں اس کے بالکلیہ قابل اعتبار ہونے کے متعلق مشکوک بھی ہیں --- مانا کہ یہ اساتذہ فن ہی کی رایوں کا ملخص ہی لیکن پھر بھی علمی معیار پر پرکھا ہوا کوئی نتیجہ نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اساتذہ فن نے اپنے تجربہ کے بعد ہی تو لکھا تھا۔ اور وہی معیار بننا چاہیئے۔ تو اس کا آسان جواب یہ ہے کہ جہاں سو اساتذہ فن کے معیار میں سو طرح کے اختلافات رونما تھے۔ وہاں اس سے زیادہ تعداد کی صورت میں تقریباً اتنے ہی اختلاف رونما ہونے کا امکان ہے۔ اور ایک ایسی اختلافی چیز کے معیار بنانے کا فائدہ معلوم۔

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر کلیپ کو اس تحقیقات سے صرف یہ فائدہ ہوا کہ انہیں اس امر کا ایقان ہو سکا کہ ماہران فن کی اکثریت شخصیت کے کن خصائص پر متفق ہو سکتی ہے۔

اس نتیجہ کو ہاتھ میں لے کر مسٹر کلیپ نے اپنے اس انکشاف سے مذکورہ بالا نقص کو دور کر دینے کے لئے ایک دوسری فاضلانہ مہم کا آغاز کیا۔

اب کی آپ نے ۴۰ اہتمام اور صدر مدارس سے خواہش کی کہ یہ لوگ اپنے اپنے اداروں کے چھ چھ موزوں مسلم الثبوت اساتذہ کا انتخاب اولاً اس طرح کریں کہ سب سے پہلے بہترین شخصیت کا استاد ہو اس کے بعد اس سے کم بہترین شخصیت کا استاد آئے اس طرح چھٹوں کا سلسلہ درج ہو۔

پھر یہی ادارہ ان ہی چھ اساتذہ کی ایک اور فہرست تیار کرے۔ اب کی دفعہ ان دس خصائص کو جو مسٹر کلیپ کے نتائج میں دریافت ہوئے سامنے رکھ کر ہر ایک خصوصیت مثلاً ہمدردی۔ شخصی وجاہت وغیرہ کے اعتبار سے ان ہی چھ اساتذہ کو جانچ کر لحاظ برتری ان کو اس فہرست میں علٰحدہ علٰحدہ جگہ دے۔

اس کوشش سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ پہلے کے سو اساتذہ فن کی رایوں کے ملخص میں جہاں ایک موزوں کامیاب استاد کی ضمانت کی گنجائش معرض اشتباہ میں

رہی جاتی تھی جس پر افسرانِ تعلیمات زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہاں اس کوشش میں یہ اشتباہ بالکلیہ رفع ہو جاتا ہے۔

غرض فہرستیں وصول ہونے پر جب ان کا امتحان کیا گیا تو یہی دس خصائص مسلّم الثبوت موزوں کامیاب اساتذہ کے اعتبار سے بلحاظ اپنی اکثریت رائے اس ترتیب سے قائم کئے جا سکے۔

(۱) طرز تقریر۔ (۲) شخصی وجاہت۔ (۳) رجائیت (۴) وقار۔ (۵) سرگرمی عمل (۶) راست بازی۔ (۷) خلوص۔ (۸) ہمدردی۔ (۹) قوت حیوانی۔ (۱۰) علمیت۔

اب اس بیان سے اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہے کہ استاد کی موزوں تعلیمی شخصیت کے کیا اجزاء ہو سکتے ہیں۔

لیکن۔ اس موقعہ پر اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھنے سے قبل اساتذہ فن کے اس نقطۂ خیال کو بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ فن تعلیم میں کسی شخص کا کامیاب استاد بننا اسکی تعلیمی جبلّت یا خلقی خصائل پر منحصر ہے چنانچہ ماہرین کا ایک طبقہ اس امر کا معترف ہے کہ "فن تدریس کی کامیابی کوئی اکتسابی فعل نہیں۔ بلکہ یہ مبداء فیض سے خال خال ودیعت ہوتی ہے"

لہٰذا ان خیالات کی روشنی میں اگر مسٹر کلیپ کی کوششوں کو پرکھا جائے تو وہ کوہ کندن و کاہ برآوردن" والی بات معلوم ہوتی ہے۔ یعنی یہ ماننا پڑے گا کہ مسٹر کلیپ کی یہ ساری کوششیں صرف ایک لاکھ یا ایک کروڑ میں سے صرف اس ایک کے لئے ہے جو مسٹر کلیپ کے اخذ کردہ نتائج کے لحاظ سے شخصیت کے خصائص تمام ازل سے اسی ترتیب کے ساتھ لے کر آیا ہو۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر اس انکشاف کے زحمت کی ضرورت بھی ایک بیکاری کے مشغلے سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ صفحۂ ہستی کے ایسے معدودے چند افراد کے لئے جو ان خصائص سے اسی ترتیب کے ساتھ ممتاز ہوں اگر یہ انکشاف کیا بھی گیا ہو تو ان کے لئے کچھ بھی مفید نہیں۔ اس لئے کہ ان کے عادات کا سونا صیقل مشق سے خود منجلی ہو گا۔ مسٹر کلیپ کا اس میں کیا کمال ؟

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذکورۂ بالا خیال صحت اور تجربہ سے کسی قدر دور ہے۔ اس امر کے تسلیم کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ کامیاب تعلیمی شخصیت کا انحصار پیدائشی یا

خلقی خصائل پر تمام و کمال ہونے کے بجائے زیادہ تر تجربہ مشق اور تربیت پر ہے۔ مسٹر کلیپ نے اس کے متعلق کافی مواد فراہم کیا ہے جس کی تشریح فی الوقت ہمارے مضمون کے حدود سے خارج ہے۔ اس لئے نتیجۃً یہ کہنا کچھ بیجا نہیں کہ تعلیمی کامیاب شخصیت کے حصول کے لئے مذکورہ بالا خصائص کے اکتساب کی کوشش معقول نگرانی۔ تجربہ۔ مشق اور تربیت سے کی جائے اور اس طرح ایک شخص کا ایک کامیاب استاد بن سکنا نامعقول نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ ان میں سے صرف ایک یعنی قوت حیوانی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کا ارتقاء باقاعدہ نگرانی اور تجربہ سے قطعی بے نیاز ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں فتور زیادہ تر کم غذا۔ کم نیند۔ کثرت کار وافکار سے رونما ہوتا ہے۔ اور اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لاعلاج بھی نہیں۔

شخصیت کی اہمیت اور اس کے اجزاء کی وضاحت کر چکنے کے بعد۔ اب میری یہ کوشش ہوگی کہ شخصیت کے متذکرہ اجزاء کی سرسری وضاحت کرتا چلوں۔

(۱) طرز تقریر:۔ غور کیا جائے۔ استاد کی شخصیت کا یہ کتنا اہم جزو ہے۔ قدرت نے دو انگل کی مضغۂ گوشت زبان ہمارے منہ میں وہ نعمت عطا کی ہے جس سے ہم خیالات۔ تاثرات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ یہی گوشت کا لوتھڑا ہمیں رسوا بھی کرتا ہے اور ہر دلعزیز بھی بناتا ہے۔ یہی چیز ہمارے دشمن زا بھی ہے اور دوست افزا بھی۔ اس سے ہم اپنے کمال کو بھی ظاہر کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح دوسروں کو اپنا گرویدہ بھی بنا لیتے ہیں۔ مشہور ہے المرءُ مخبوءٌ تحت لسانہٖ یعنی تا مرد سخن نہ گفتہ باشد۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد۔

یہ سب صحیح۔ لیکن یہ سب اسی زبان کی طرز ادا پر منحصر ہے۔ مشہور ہے بات بات میں انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ یہی زبان شستگی۔ ملائمت۔ شیرینی۔ نفاست اور راستی میں ڈوبی ہوئی ہو تو پھول جھڑاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک بے پناہ شمشیر دودم ہے اب استاد کی حالت میں میرے اس بیان کو رکھ کر پرکھئے تو امید ہے کہ استاد کے لئے طرز ادا یا بیان کی برتری کے لزوم کو مان لینے سے انکار نہیں کیا جا سکیگا۔ جائے غور و انصاف ہے۔ وہ استاد جس کی تفہیم طلباء کو مطمئن نہ کر سکتی ہو جس کے احکام اطاعت اور فرمان پذیری کی طرف طلباء کو بخوشی مائل کرنے کے بجائے نافرمانی

اور قانون شکنی کے لئے اکساتے ہوں جس کے نا ملائم طرز تخاطب کے ناگوار اثرات طلبا سے گزر کر محلے اور شہر میں گشت کر رہے ہوں۔ فرمائیے یہ اسی لسان یا طرز بیان کے خاص برا انداز اثرات کے نتائج نہیں تو اور کس کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ صمیم قلب سے کہئے ایسا شخص اپنا کیا اثر قائم رکھ سکتا ہے اور ایسی بے اثر ہستی سے نونہالان شرکائے درسگاہ کیا استفادہ کر سکتے ہیں۔ اسی لئے وہلۂ اول ہی میں ضروری ہوا کہ طرز تقریر کو سب سے پہلے اُستاد درست کرنے کا خیال رکھے۔

(۲) شخصی وجاہت:۔ اس سے میں بھی ایک مجسمۂ حسن و خوبی ہرگز مراد نہ لوں گا میں سمجھتا ہوں شخصی وجاہت نہ حسن کا نام ہے نہ پر رعب تن و توش کا۔ نہ نفیس سوٹ ہیں یہ خصوصیت مجھے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور نہ تعلیم یافتہ حضرات کے نفیس مکلف کسی دیسی لباس میں یہ پنہاں معلوم ہوتی ہے۔ آپ معاف فرمائیں اگر میری رائے خطا نہ کر رہی ہو۔ تو میں اس کو ایک سادی سیدھی چیز سمجھتا ہوں اور بس جیسے ہر ایک انسان۔ اس کی خصوصیت نہیں کہ وہ معلم ہی ہو چاہے تو اپنے نفس پیدا کر سکتا ہے۔ یہ چیز۔ میرا خیال ہے صرف ستھرے لباس۔ راست گفتاری راست کرداری میں اس طرح پیوست ہے جس طرح بو گل میں۔ یہ چیز اپنی نشست برخاست طرز زندگی میل ملاپ کی ہر اس ادا میں گھلی ہوئی ہے جس سے سلیقہ بردباری۔ صبر۔ سکون۔ تحمل۔ اور صلاحیت ٹپکی پڑتی ہوں! بس اسی کا نام میری دانست میں اعلیٰ شخصی وجاہت ہے بے ادبی معاف وہ ایک معمولی دیسی لباس میں بھی جلوہ گر ہو سکتی ہے۔ اور پر رعب فاتحانہ ملبوس میں بھی ملفوف ہو سکتی ہے۔

(۳) رجائیت:۔ اس لفظ کی فلسفی گتھیوں میں اُلجھنے کے بجائے میں صرف اس کو مضمون سے متعلقہ حدود تک اپنے معمولی الفاظ میں جن کو فلسفیانہ موشگافی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ واضح کر دوں گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج ہمارے ملک کا نظام تعلیم وہ نہیں جو آج سے دس سال قبل رہا بیسیوں ہی تغیرات رونما ہو چکے۔ اسکاوٹنگ۔ ڈبیٹنگ۔ تعلیمی تفریحین سوشل جلسے۔ تعلیمی نمائشیں۔ خود مدرسہ کا باغیچہ۔ کھیل کا باقاعدہ پروگرام وغیرہ وغیرہ غور کیا جائے تو بیسیوں ہی چیزوں نے ہمارے نصاب تعلیم میں اس غرض

کے لئے کہ طلباء میں ان کو ماحول کے مطابق کر دینے کی صلاحیت پیدا کی جائے اثر ونفوذ پیدا کر لیا ہے۔ جائے انصاف ہے۔ بچہ ادب کی تعلیم۔ کچھ استادانہ نظم و نثر کی باریکیوں پر عبور۔ کچھ قصے۔ پڑوس اور اطراف عالم کے کچھ ناقابل وثوق معلومات آج کل ہمارے بالکلیہ اجزائے نصاب تعلیم باقی نہیں رہ سکتے۔ جواب سے کچھ عرصہ پہلے تھے اور یہ ضرورت بالکل بدیہی ہے۔ جہاں زمانہ نے کروٹ لی۔ جنگ عالمگیر نے انسانی زندگی کے رخ کی کایا ہی پلٹ دی۔ سائنس کی حیرت انگیز ایجادوں نے عالم کو زیر و زبر کر ڈالا۔ تو ظاہر ہے اس عالمگیر انقلاب کے عالم میں نظام تعلیم کس طرح محفوظ رہ سکتا تھا۔ بفرض محال اگر محفوظ رہ بھی سکتا تو اس کو قطعی مکمل نہ مانا جاتا اس لئے کہ وہ ہماری زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کو سلجھانے سے قطعی قاصر رہتا۔ اسی لئے ہمارے نصاب میں آئے دن مفید اور صحت بخش اصلاحات کی زیادہ سے زیادہ گنجائش نکالنے کی مساعی بلیغ عمل میں لائی گئیں اور لائی جارہی ہیں۔

اندریں حالات وہ استاد جو ان انقلابات کو تہ دل سے خیر مقدم کرنے کیلئے تیار نہ ہو۔ یقین ہے کہ کبھی ہمارے اس موجودہ نصاب کے لئے جس میں ہماری بڑھتی ہوئی ضروریات کی زیادہ سے زیادہ گنجائشیں محفوظ رکھی جارہی ہیں۔ مفید ثابت نہ ہو سکیگا۔ اور اس لئے نہ اپنے طلباء کو ان ضروریات زندگی کے لئے تیار کر سکے گا جن کی خاطر یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔

(۴) وقار:۔ اس سے مراد استاد کا ایک ایسا خوشگوار رعب طلباء پر قائم کرنا ہے۔ جس سے یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ وہ طلباء کے ارتقائے نفس میں حارج نہ ہو۔ اس سے مراد طلباء کے ساتھ استاد کی پر وقار سنجیدگی ہے۔ لیکن نہ ایسی کہ طلباء لب کشائی کی جرأت نہ کر سکیں۔ لیکن اس سے ایک ایسی سنجیدگی مراد ہے کہ وہ ایک طرف طلباء کے تفریحی ساعات کا بھی شریک کار رہے اور دوسری طرف اس کی سنجیدگی سیماب طبع طلباء کی شوخیوں سے مجروح بھی نہ ہونے پائے۔

(۵) سرگرمی عمل:۔ ظاہر ہے ستعدی سے معری انسان جہاں زندگی کے ہر پہلو میں ناکام رہنے کا امکان رکھتا ہے۔ ضبط میں کیسے کامیاب ہو سکیگا؟ ظاہر ہے کہ ڈھیلا ڈھالا کھلے بند اڑنے کے آرزومند کھیرو پر کوئی طاقتور روک قائم

نہیں رکھ سکتا۔

(۶) راستبازی:۔ یقین مانئے انسان ہو کر اپنے کو راست گفتار اور راست کردار نہ رکھنے سے تو کچھ اور ہی ہو کر زندہ رہنا اچھا ہے۔ طلبار اپنے ایک ایسے حضرت کو بے ادبی معاف راستے کے بازی گر کی اتنی بھی وقعت دیئے جانے کے مستحق نہیں سمجھتے۔

(۷) خلوص:۔ استاد کے لئے میں اس صفت کو عزت کا رکن اوّل سمجھتا ہوں یا دوسرے الفاظ میں چاند کو روشنی سے شکر کو حلاوت سے حسن کو ملاحت سے جتنی وقعت حاصل ہو سکتی ہے۔ اتنی ہی خلوص سے استاد کی کارکردگی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

(۸) ہمدردی:۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیان

بے حس اور غیر ہمدرد انسان اپنی افادی حیثیت میں بجنسہٖ حرف شکستہ یا استخوان بے مغز کے اتنی قیمت رکھتا ہے۔

(۹) قوت حیوانی:۔ بالخصوص ضبط کے بارے میں اس صفت سے عاری استاد کے لئے تو وہی مثل صادق آتی ہے کہ کمزور بلی کو چوہا کہانی سنانے دعوت دے، اور پھر ضبط کی خیریت معلوم!

اس سے یہ مراد نہیں کہ استاد اپنے زمانہ کے زبسکو یا گاما ہی بنے رہیں البتہ اس کے مقابلہ میں بعض اوقات یہ دیکھا گیا کہ مدرسین نحیف، لاغر، دبلے، پتلے ہوتے ہیں۔ چہرے اور ہاتھوں پر جھریاں آنکھوں سے کمزوری اور ڈر عیاں ہوتا ہے یہاں کم سے کم ان ہی چیزوں کے ارتفاع کی جانب توجہ مبذول کرانی منظور ہے کہ نہ صرف ناتجربہ کار کم سن طلبار بلکہ اولیاء کی بھی نظر اولیں میں استاد اپنے جثہ اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے کچھ جچ بھی سکے۔

(۱۰) علمیت:۔ استاد کے لئے اس کی ضرورت ظاہر ہے۔ لیکن میں یہاں ایک مشورہ مختصراً دونگا۔ وہ یہ کہ استاد۔ حاضر جواب۔ علمی ظرافت سے پُر اپنے سبق پر خاصا حاوی اور طلبار کو اس طرح مطمئن کر دینے والا ہو کہ وہ اس کی غیبت میں اس کے

پختہ معلومات اور اعلیٰ تفہیم کا پرچار ساتھی۔ اولیاء اور اہل محلہ کے سامنے کرنے کے سوا دوسرا حرف شکایت زبان پر نہ لاسکیں۔

اس میدان میں اس کا دل شیر کی طرح اپنے طلباء سے بھالوں آگے نکلا ہوا ہو۔ وہ اس خصوصیت میں ایسا شہسوار ہو کہ طلباء شرارتاً یا امتحاناً اگر کبھی مقابلہ پر بھی اتر آئیں۔ تو ادھر اس نے اپنے یکہ تاز علم کو مہمیز کیا اور اُدھر شوخ مزاج امتحان کے شوقینوں کو غبار کارواں میں گم ہو کر رہ جانے کے سوائے کچھ بھی سجھائی نہ دے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تشنگان علم کو پریشان کر کے خود کو خوش کام بنائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی ضرورتاً اپنے جوہر آبدار علم کو لاعلم طلباء کی گھٹا ٹوپ فضاء میں اس طرح جھلکا دے کہ ایک طرف ان کی پر انوار شعاعیں ان کے دیدہ دل کو روشن کر دیں۔ تو دوسری طرف خود ان میں یہ خصوصیت پیدا کر لینے کا شوق اُن کو اُن کی اپنی آبلہ پائی پر پست ہمت نہ ہونے دے!

اب تک میں ایک کمزور شخصیت کے استاد کے لئے وہ امور پیش کر رہا تھا جن پر کاربند ہونے سے انسان ایک اعلیٰ شخصیت کا حامل ہو سکتا ہے۔ لیکن اب اس ضمن میں چاہتا ہوں کہ وہ جراثیم بھی دکھادوں جو اندر ہی اندر گھن کی طرح استاد کی شخصیت کو کھوکھلا کر کے بٹھا دیتے ہیں۔

(۱) ۔ طلباء سے کم سے کم خفیہ طور پر ہی سہی اور اقل قلیل مقدار ہی میں تنفر استاد بھی حق یہ ہے کہ بچوں کے لئے بس کی ایک گانٹھ ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ معلم و متعلم کے نقاط خیال میں بُعد المشرقین کا فرق ہوتا ہے۔ ایک جس چیز کا ارادہ رکھتا ہے۔ دوسرا اس سے کتراتا ہے۔ معلم صیاد ہے تو متعلم آہوئے رم خوردہ۔ پس ایسی صورت میں اگر اسے تنفر کا بھی کوئی فعل استاد سے سرزد ہو تو پھر تعلقات کی شکستگی میں مزید اضافہ کی صورت پیدا ہوتی جائے گی اور اس طرح غرض مفقود ہوتی جائے گی۔ اس لئے ایسی صورت میں استاد کو محض یہ سمجھنے کی بجائے کہ وہ ایک مسلح جنگی سپاہی ہے۔ جسے اپنے مدمقابل ننھے دشمن کو مغلوب کرنے کا کام دیا گیا ہے۔ یہ سمجھے کہ وہ ایک مبصر حکیم ہے۔ جس کے سپرد ایک نازک مرحلہ کا مریض کیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی نظم و قوت کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ ملاحظہ ہو۔ طبیب اپنے مریض سے نہ متنفر ہو جاتا ہے۔ نہ اتنی

ہمدردی صرف کرتا ہے کہ خیر خواہی کے سلسلہ میں اُسے لٹا دے۔ نہ وہ مرض کی سختی کو اپنے وقار کے لئے ایک کاری ضرب تصور کر کے مریض سے متنفر ہو کر خود کو بے تعلق کر لیتا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ طبیب کے لئے یہ تو ایک موقعہ ہے اپنی اعلیٰ فنی قابلیت کے مظاہرہ کا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا بقول حضرت غالب

ع۔ رنگ کھلتا جائے ہے جوں جوں کہ اڑتا جائے ہے۔

مرض کی شدت پسندی اس کی طبی مہارت کو ایک پر شوق دعوت عمل دیتی ہے نہ کہ اس کے جذبات کو برانگیختہ کر کے مریض کے خاتمہ کا باعث ہو جاتی ہے۔

یہی حال معلم متعلم کا ہے۔ کہ بچہ کی نازیبا شرارتوں کو متبصر طبیب کی طرح اپنے نفس میں تنفر و برانگیختگی کے خفیف سے جذبات پیدا کئے بغیر اپنی فنی قابلیت کو دعوت عمل دیکر اصلاح اور سدھار کے مسائل پر غور کرے۔ نہ کہ متنفر اور برانگیختہ ہو کر بچہ کی شخصیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔

(۲) عدم فراست یا معاملہ نافہمی: مسٹر لیٹر (Mr. Litter) نے اپنی تحقیقات میں اس کو بھی ضبط کے نقص کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ بعض افراد خداداد معاملہ فہمی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اور کسی معاملہ کے مخاصمانہ پہلوؤں کو فوراً بھانپ کر ان مشکلات سے بچنے کی راہیں سوچ لیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ لوگ جو اس معیار پر نہیں اترتے۔ ان کی معاملہ فہمی کی عادت بتدریج تجربہ اور حصول مشورہ سے پختہ ہو جاتی ہے۔

اس معاملہ نافہمی کے سبب بعض حرکات ایسی ہو جاتی ہیں جو جذبات کو مجروح کر دیتی ہیں۔ کیونکہ جذبات عموماً ہر مناسب اصلاح کے مقابلہ میں ناراض ہو جانے کا میلان رکھتے ہیں جس کے بعد مصائب خود بخود بدعو ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اس لئے نظم مدرسہ کے لئے بہترین اصول بھی ہے کہ اس کے قواعد جتنے کم ہوں اچھا ہے۔ اور پھر یہ کم قواعد بھی خاص احتیاط اور تفکر کے بعد رائج ہوں۔ گویا اس کا مطلب یہ کہ قاعدہ صرف اس صورت میں نافذ کیا جائے جبکہ اس کی قطعی ضرورت محسوس کی جا رہی ہو۔

ایسی صورت میں خوش قسمت ہیں وہ مدرس جو مافوق الاحساس طلباء سے دوچار ہوں۔ جن کے لئے آنکھ کا ایک اشارہ ہی ضوابط کی ضخیم جلدوں کی تعلیم دے جاتا ہے۔

معاملہ نا فہمی کے سبب بعض اوقات اولیاء طلباء یا افراد قوم سے گفتگو کے مواقع پر عموماً استاد کو شکست اٹھانی پڑتی ہے۔ اس طرح طلباء میں اس کا اثر کمزور ہو کر ضبط کی خرابیوں میں توفیر رو نما ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے مواقع پر بہتر یہ اصول یہی ہے کہ استاد خود کو پر سکوں رکھنے کی کوشش کرے۔ تنظیم مدرسہ کے نقطۂ نظر سے ایسے مواقع پر مدرسہ کے اختیار کردہ اُصول کی وضاحت کرنے میں گو ایک تعلیمی ساعت ہی کیوں نہ نذر ہو جائے فضلائے وقت کی نظر میں پھر بھی یہ اس کی حقیقی قیمت سمجھی جاتی ہے۔

(۳) کمزوری رائے :۔ یہ خرابی اگر خلقی ہو۔ تو اس کا اندفاع بھی مشکل اس لئے نہیں کہ جہاں تو ریثی دیگر نقائص مناسب ذرائع سے رفع ہو سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ خلقی کمزوری رائے قطعی نا قابل اصلاح ہو۔

یہ نقص عموماً ذمہ داری و اقتدار کے عدم تیقّن سے پیدا ہوتا ہے۔ خصوصاً جب کہ بالغ افراد حکام مدرسہ کے خلاف طلباء کی ہیچ پر تل جائیں۔ ایسی صورتوں میں خصوصاً متنقل مزاج مدرسین کا خاص نقصان اس لئے ہوتا ہے کہ کمزور رائے والے مدرسین خوشامد یا دیگر ذرائع سے عوام میں اثر حاصل کر لیتے ہیں۔ یا یہ کہ مدرسہ کسی کمزور فطرت کے صدر کے تحت ہو جو اپنی پوزیشن کی حفاظت کی خاطر۔ مدرس کا ساتھ چھوڑ کر۔ بقول جان بچی لاکھوں پائے۔ مدرس کو ورطۂ ہلاکت میں پھینک خود طلباء کا طرفدار ہو کر تھیلا ٹنگ جائے۔ اس طرح مدرس بہ مشکل اس حیثیت میں ہو سکیگا کہ قیام ضبط کے وہ ذرائع اختیار کر سکے جو اس کی رائے میں ضروری ہیں۔ غرض ضبط کی یہ خرابیاں کمزوری رائے کا نتیجہ ہیں۔

ایسی صورتوں میں افسر تعلیمات یا صدر مدرسہ کی جانب سے پر خلوص تہ دل سے امداد کے ذریعہ حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۴) مغلوب الغضبی :۔ گو کہ اس عادت سے استاد کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ طلباء پر اپنا رعب جما سکے۔ اور طلباء اس کے مطیع ہو جائیں لیکن حق یہ ہے کہ ایک ٹھوس ضبط کا یہ خاصہ نہیں۔ پروفیسر (William Lyon Phelps) اپنی کتاب Teaching in School and College) میں لکھتے ہیں کہ طلباء کے سامنے اظہار غیض و غضب کرنے کی بجائے تو یہ مناسب ہے کہ صحن میں ہو جائیں اور کھمبا تو چنا شروع کر دیں۔

وہ کہتے ہیں جب میں معلم تھا۔ ایسے غصہ کی حالت میں کرسی کے ہتھے مٹھیوں میں پکڑ لیتا۔ اور اپنے منہ کے جھاگ کو نگلنے کی کوشش کرتا یہاں تک کہ مجھے اپنے نفس پر قابو حاصل ہو جاتا۔ تب کہیں میں طلباء سے گفتگو آغاز کرتا۔

اتنا لکھ کر موصوف لکھتے ہیں:۔

"بچے یہ سب واقعات دیکھتے۔ اور وہ کچھ سیکھتے جو کتاب نہیں سکھا سکتی...... ؟

غرض اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ اگر مدرس کچھ یوں اپنی شخصیت کو ڈھالنے کی کوشش کرے تو توقع کی جا سکتی ہے کہ طلباء ایسی شخصیت سے متاثر ہو کر منضبط ہو سکیں گے۔ اور اسی موزوں شخصیت سے ضبط مدرسہ میں ایک معتدبہ امداد ملنے کی توقع رکھنی بیجا نہیں۔

طلباء کی عام بیماریاں اور ان کا آسان علاج

حکیم محمد فاضل صاحب فاضل — مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ

ملیریا

یہ ایک نہایت موذی اور مہلک مرض ہے تمام دنیا میں مختلف امراض سے جس قدر اموات واقع ہوتی ہیں ان میں سے دو تہائی اموات صرف بخار خصوصاً ملیریائی بخار اور اس کے عوارض سے واقع ہوتی ہیں چنانچہ ہندوستان میں ہر سال ۱۰ لاکھ جانیں اس مرض سے ضائع ہو جاتی ہیں یہ ایک ایسا مرض ہے جس سے سارے نظام جسمانی میں خلل پڑ کر بیسیوں عوارض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں ملیریا نہ پایا جاتا ہو اگرچہ سرکاری طور پر اس کے انسداد کے لئے بہت کچھ کوشش ہو رہی ہے مگر جب تک عوام الناس بھی اس نسل انسانی کے خونخوار دشمن کو تباہ کرنے میں اپنی پوری کوشش سے

کام نہ لیں تو خاطر خواہ کامیابی ناممکن ہے۔ چونکہ اس مرض میں بہ نسبت مردوں کے بچے زیادہ مبتلا ہوتے ہیں اس لئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ بچوں کو بھی اس کے انسداد کی تدابیر سے واقف کرایا جائے۔

ملیریا کی ماہیت ملیریا ایک متعدی بیماری ہے جو خون میں ایک خاص قسم کے جراثیم کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے۔

علامات بخار کا ہونا تلی اور جگر کا بڑھ جانا اور کمزوری وغیرہ اس مرض کے خاص علامات ہیں۔

ملیریا کے اسباب ملیریا کا اصل سبب تحقیقات جدیدہ کی رو سے ملیریائی جراثیم ہیں جو زیادہ تر ایک خاص قسم کے مچھر کے کاٹنے سے جس کو ملیریا کا مچھر کہتے ہیں) جسم انسانی میں داخل ہوتے ہیں۔

مقام گرم ممالک نشیبی اور مرطوب مقامات اور دلدلی زمین ملیریا کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہے۔

انسداد کی تدابیر (۱) مچھروں سے محفوظ رہنے کے لئے مچھر دان استعمال کریں یا کم از کم سوتے وقت سرسوں کا تیل یا روغن گندمنہ اور ہاتھ پر مل لیں اس طرح عمل کرنے سے مچھر نہیں کاٹتے۔

(۲) چونکہ مچھر کثیف اور اندھیرے مکانوں میں رہتے ہیں اس لئے مکانوں کی صفائی نہایت ضروری ہے۔ مکان میں ہر طرف جھاڑو دیجائے خصوصاً کونوں میں اندروں کے نیچے اور الماریوں کے پیچھے ضرور جھاڑا جائے تاکہ مچھر ان مقامات سے بھاگ جائیں۔

(۳) روزانہ کمرے کے دروازوں اور دریچوں کو دھوپ کے وقت دو تین گھنٹہ کے لئے کھلا رکھنا چاہیئے تاکہ اور ہوا اور روشنی کا بخوبی گزر ہو اور مچھر نکل جائیں۔

(۴) کمروں میں عود، گوگل، خصوصاً عاقر قرحا کی دھونی دی جائے کیونکہ اس سے مچھر بھاگ جاتے ہیں۔

(۵) چونکہ مچھر بند پانی میں انڈے بچے دیکر اپنی نسلیں بڑھاتے ہیں اس لئے موریوں کو اچھی طرح پاک صاف رکھا جائے اور گھر میں اور گھر کے اطراف کسی جگہ پانی ٹھہرا رہنے نہ دیا جائے اگر کسی گھر میں کنواں ہو اور اس میں مچھروں کے انڈے بچے پائے جائیں تو

ایسی صورت میں تھوڑا اسا مٹی کا تیل چھڑک دینے سے وہ تلف ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کبھی کبھی موریوں میں بھی تھوڑا اسا مٹی کا تیل چھڑک دیا جائے۔

(۶) تبدیل موسم کے وقت خصوصاً گرمیوں کے آخر میں اور برسات کے موسم میں چونکہ ملیریا کا اثر زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان ایام میں پانی کو جوش دیکر پیا جائے اور تھوڑی مقدار میں چائے کا استعمال بھی مفید ہوتا ہے اور غذا میں سرخ مرچ کی بجائے کالی مرچ کا استعمال مناسب ہے۔

(۷) برسات کے موسم میں رات کی سردی اور شبنم سے اور دن میں زیادہ دھوپ میں پھرنے سے پرہیز کیا جائے۔

اقسام ملیریا

علامات کے لحاظ سے ملیریائی بخاروں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) نوبتی بخار۔ یعنی باری کا بخار۔

(۲) لازمی بخار۔ (جس میں دھیمی حرارت ہر وقت رہتی ہے اور دن میں ایک دو دفعہ تیز ہو جاتی ہے۔

نوبتی بخار کی قسمیں (۳)

ا۔ روزانہ بخار جس کا دورہ ۲۴ گھنٹے کے بعد ہوتا ہے۔

ب۔ تجاری بخار جس کا دورہ ۴۸ گھنٹے کے بعد ہوتا ہے۔

ج۔ چوتھیا بخار جس کا دورہ ۷۲ گھنٹے کے بعد ہوتا ہے۔

نوبتی بخار کی علامات ان نوبتی بخاروں میں عام طور پر کم و بیش ابتدا میں سردی محسوس ہوتی ہے پھر جسم گرم ہو جاتا ہے بعد از اں پسینہ آکر بخار اتر جاتا ہے۔

بحالت بخار عام علاج اگر کھانا کھانے کے بعد بخار چڑھے تو مقی دوا پلا قے کرا دینی چاہیئے چنانچہ اس مطلب کے لئے آدھی چھٹانک نمک آدھ سیر گرم پانی میں ملا کر پلا دیں تاکہ خوب مکمل قے آجائے اور طبیعت ہلکی ہو جائے پھر مذکورہ بالا مدارج بخار میں سے ہر درجہ کا علاج سلسلہ وار شروع کر دیں۔

ا۔ جب سردی محسوس ہونے لگے تو گرم کپڑے اڑھائیں اور گرم اینٹ یا گرم پانی کی

بوتلوں سے ہاتھ پاؤں وغیرہ کو سینک کر گرمی پہونچائیں۔

۲۔ جب سردی کا درجہ ختم ہو جائے اور گرمی محسوس ہونے لگے تو گرمی کا علاج کریں یعنی گرمی دور کرنے کے لئے پنکھا کریں اگر بخار تیز ہو جائے تو سر پر برف یا ٹھنڈے پانی میں کپڑا بھگو کر رکھیں۔ اور بطور دوا معرقات (پسینہ لانے والی دوائیں) مدرات (پیشاب لانے والی دوائیں) مسہلات حسب ضرورت و مناسبت وقت استعمال کریں۔ بصورت قبض رفع قبض کی سب سے پہلے فکر کریں۔

بخار اتر جانے کے بعد

کونین کا استعمال شروع کردیں جو ملیریائی بخاروں کو دور کرنے میں سب سے زیادہ زوداثر دوا ہے اس طرح کہ پہلے تین چار روز تک پانچ پانچ گرین کی تین خوراکیں استعمال کروائیں اس کے بعد ایک ہفتہ تک دو تین گرین کونین روزانہ استعمال کرتے رہیں مگر کونین کے استعمال سے پہلے مسہل دیکر معدہ کو صاف کردینا ضروری ہے تاکہ بجائے قبض فضلہ کا زہریلا مادہ خون میں جذب ہو کر اس کی قوت مدافعت کو کم نہ کردے۔ اگر کونین کے ساتھ مریض دودھ کا استعمال زیادہ رکھے تو پھر کونین کی گرمی اور خشکی معلوم نہیں ہوتی کم عمر بچوں کو بجائے معمولی کونین کے جو بہت تلخ ہوتی ہے بے ذائقہ کونین جس کو یوکونین کہتے ہیں شربت یا دودھ کے ہمراہ دینی چاہیئے۔

درج ذیل مفردات کا استعمال بھی مسہل کے بعد چند روز تک متواتر رکھیں تو فائدہ مند ہے۔

اجوائن سادہ ۷ ماشہ پانی میں جوش دیکر استعمال کریں۔

گجگے کے مغز کا سفوف ایک ماشہ کی مقدار میں، ۷ عدد کالی مرچ کو پانی میں رگڑ کر اس کے ساتھ استعمال کریں۔

غذا حالت بخار میں سادہ آش جو یا اس میں سوڈا واٹر یا دودھ ملا کر استعمال کرائیں۔ وقفہ کی حالت میں دودھ چاول مونگ کی دال شوربا وغیرہ دیں۔

پرہیز ثقیل اور نفاخ اغذیہ سے پرہیز کریں۔

زکام

ماہیت یہ ایک چھوت دار مرض ہے جس میں ناک کی اندرونی لعابدار جھلی متورم

ہو جاتی ہے تحقیق جدید میں اس مرض کا باعث ایک خوردبینی کیڑا ہے جو شدید زکام کی حالت میں ناک کی ریزش اور لعاب دہن میں پایا جاتا ہے۔

اسباب | ٹھنڈ لگنا خصوصاً گردن اور پاؤں کو سردی لگنا سرد ہوا میں یا سیلی زمین پر بہت عرصہ تک بیٹھنا رات کو دیر تک سردی میں رہنا۔ گرم کھانا کھاتے ہوئے سرد پانی پینا۔ یا خراش پیدا کرنے والے ذرات یا بخارات کا ناک میں داخل ہونا عام طور پر اس مرض کے اسباب موید خیال کئے جاتے ہیں۔

علامات | اس مرض میں طبیعت سست کنپٹیوں میں بوجھ سر میں خفیف درد، ناک بند رہتی ہے چھینکیں آتی ہیں شدت کی حالت میں قوت شامہ سامعہ اور ذائقہ میں بھی قدرے فتور واقع ہو جاتا ہے حلق کی اندرونی جھلی بھی سرخ اور متورم ہو جاتی ہے اس کے ساتھ جسم میں خفیف حرارت بھی رہتی ہے۔

علاج | خفیف حالت میں علاج کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ معمولی احتیاط اور پرہیز سے دو تین روز میں آرام ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں سردی سے بچنا۔ پانی حتی الامکان کم پینا اور ٹھنڈا پانی نہ پینا اور رات میں کمبل یا لحاف اوڑھ کر سونا چاہیئے اور سوتے وقت گرم چائے یا تھوڑا گرم پانی بطور چائے استعمال کرنا اچھا ہے تاکہ جسم گرم ہو کر کچھ پسینہ نکل آئے۔

غذا | لطیف اور زود ہضم غذا استعمال کریں۔

پرہیز | ترش چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔

کھانسی

عام طور پر اس کو معمولی مرض سمجھا جاتا ہے اور اس کے علاج کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی جاتی حالانکہ یہ مرض لاپرواہی کی حالت میں خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور مرض سل پیدا ہو جاتا ہے پھر جس سے جانبر ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔

ماہیت | یہ آلات تنفس کی ناطبعی حرکت ہے جو دفع اذیت کیلئے ہوتی ہے۔

اسباب | شش کے مزاج کی خرابی خواہ سادہ ہو یا کسی خلط کے سبب سے ہو شش میں ورم یا بثور یا قرحہ ہو جائے۔ یا کوئی ناطبعی چیز جیسے غبار وغیرہ آلات تنفس میں

ہو پہنچ جائے۔ کبھی یہ مرض دوسرے اعضاء کی مشارکت سے بھی ہوتا ہے۔

علاج معہ علامات اگر موسم گرما میں خشکی کا سفر یا گرم ہوا میں زیادہ قیام یا گرم غذاؤں کے استعمال سے شش کے مزاج میں گرمی پیدا ہو جائے تو اسپغول اور آش جو استعمال کریں اور ٹھنڈی ہوا میں رہیں اگر نزلہ حار دماغ سے شش پر گرے تو اس کی علامت یہ ہے کہ کھانسی رات میں اٹھتی ہے تو ایسی صورت میں خشخاش کے ڈونڈوں کو جوشاندہ کر غرغرہ کریں اور نزلہ کے دفعیہ کی تدبیر کریں اگر شش کا مزاج سادہ سردی کے سبب بگڑ جائے جیسے سرد ہوا میں زیادہ عرصہ تک رہیں یا زیادہ سرد پانی کا استعمال کیا جائے تو ایسی حالت میں انجیر منقی اور ملٹھی کا جوشاندہ استعمال کریں۔

اگر زکام کے بعد کھانسی ہو جائے تو ایسی صورت میں انجیر اور زوفا کا جوشاندہ استعمال کرنا مفید ہے یہ مرض شش میں رطوبت کی زیادہ تولید کے سبب بھی ہوتا ہے یہ صورت بلغمی مزاج والے بچوں اور مرطوب مزاج بوڑھوں میں زیادہ پائی جاتی ہے ایسی صورت میں تنقیہ بلغم کی کوشش کریں اس طرح کہ ملٹھی اور سولی کے بیجوں کو جوش دیکر اور اس میں شہد ملا کر پلائیں اور قے کرائیں۔ اور تھوڑی مقدار میں ہینگ کا استعمال مفید ہوتا ہے۔

اگر غبار یا دھواں یا زور سے چیخنے کے سبب شش میں خشونت پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں مرطب حریرے زیادہ مفید ہیں۔ اگر قرحہ یا بثور کے سبب یہ مرض ہو تو کسی لائق طبیب سے رجوع کریں۔

مسوڑھوں سے پیپ نکلنا (پائیوریا)

یہ مرض بھی آج کل بہت عام ہے اس کے سبب چونکہ صحت جسمانی بہت جلد خراب ہو جاتی ہے اس لئے اس کی طرف بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ اس مرض میں علاوہ گندہ دہنی کے پیپ کی سمیت خون میں جذب ہو کر دق کی شکایت بھی پیدا ہو جاتی ہے علاوہ ازیں کئی قسم کے موذی امراض پیدا ہو جاتے ہیں

علامات ابتدائی مرض میں مسوڑھے پھول جاتے ہیں اور ان میں سے خون نکلتا ہے اور آخر درجہ مرض میں مسوڑھے سکڑ کر پیلے پڑ جاتے ہیں اور مسوڑھوں کو دبانے سے

پیپ بھی خارج ہوتی ہے دانتوں کی جڑیں برہنہ ہو جاتی ہیں اور وہ ہلنے لگتے اور آخر میں گر جاتے ہیں ۔

اسباب | منہ اور دانتوں کا میلا رہنا ۔ بعد غذا غذا کے ذرات کا دانتوں کی جڑوں میں پھنسا رہنا اور وہیں متعفن ہو جانا ۔

حفظ ماتقدم | ہمیشہ منہ اور دانتوں کو صاف و پاک رکھا جائے اور صبح منہ دھوتے وقت ببول یا نیم کی تازہ نرم مسواک کرنی چاہیئے ۔

علاج | دانتوں کو پاک وصاف رکھا جائے اور مسوڑھوں کی تقویت اور صفائی کیلئے قابض اور کرم کش ادویہ استعمال کی جائیں اس طرح کہ سرکہ میں مسور اور رخشک دھنیے کو جوش دیکر مریض کو کلیاں کرائیں اور کافور گھس کر مسوڑھوں پر لگائیں ۔

سنگ جراحت جس کو عام طور پر بلغم کہتے ہیں (جو ایک معدنی چیز ہے) اس کو جلا کر سفوف بنالیں اور بطور منجن استعمال کریں تو یہ مسوڑھوں کو مضبوط کرنے کے علاوہ دانتوں کو صاف کرتا ہے ۔

کان بہنا

ماہیت | اس مرض میں کان کی بیرونی نالی کی جھلی متورم ہو جاتی ہے اور اس میں سوزش ہو کر کان سے پیپ بہنے لگتی ہے ۔

سبب | اس کا سبب اکثر سردی اور بدہضمی ہے اور کبھی یہ مرض بعض جلدی امراض کے ضمن میں بھی ہو جاتا ہے ۔

علاج | ہائیڈروجن پر اکسائیڈ سے کان صاف کریں بعد ازآں بورک ایسڈ کان میں پھونک دیں ۔ یا سونف اور نیم کے پتوں کو جوش دے کر اور اس میں تھوڑا تھوڑا شہد ملا کر کان میں پچکاری کریں اور پھر رطوبت کو خشک کرنے کے لئے کپڑے کی ایک باریک بتی بنا کر اس پر باریک پسی ہوئی پھٹکری چھڑک دیں اور اس کو کان میں رکھیں جب اس طرح اندر کی رطوبت خشک ہو جائے تو پھر زرد کوڑی کو جلا کر اس کی راکھ کان میں پھونک دیں یا مازو سوختہ کو باریک پیس کر سرکہ اور روغن گل میں حل کر کے کان میں ٹپکائیں ۔

نظر کی کمزوری

آج کل بچوں میں یہ شکایت بھی عام ہے جس کے سبب وہ بغیر چشمہ کی مدد کے لکھ پڑھ نہیں سکتے۔

سبب اس کا بڑا سبب دماغی یا عصبی کمزوری ہے اور اکثر یہ شکایت کثرت مطالعہ یا باریک بینی سے پیدا ہو جاتی ہے۔

علامات تھوڑی دیر لکھنے پڑھنے سے آنکھیں دکھ جاتی ہیں اور سامنے اندھیرا سا آجاتا ہے کبھی پڑھتے وقت حروف کے نقوش کچھ غیر متاثر ہو جاتے ہیں آنکھوں سے پانی آنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ سر میں خفیف درد بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔

علاج اصل سبب کو رفع کریں یعنی اگر دماغی کمزوری ہے تو تقویت دماغ کے لئے مغزیات استعمال کریں باریک بینی ترک کریں آنکھوں کو آرام دیں سرد پانی سے آنکھ دھوئیں صبح شام پر فضا اور سبزہ زار مقامات کی سیر کریں۔

بطور دوا صبح و شام درمیان غذا شربت فولاد استعمال کریں یا سونف اور شکر سفید مساوی سفوف بنا کر سوتے وقت تولہ ڈیڑھ تولہ کھا لیا کریں۔

غذا ثقیل اور نفاخ اور ترش چیزوں سے پرہیز کریں۔ ہلکی غذا کھائیں اور تمباکو نوشی بالکل ترک کر دیں۔

شذرات

آج بتاریخ ۲۶ شہریور ۱۳۴۶ف بوقت ۱ بجے دن باجلاس عالیجناب ناظم صاحب تعلیمات زیر صدارت عالیجناب موصوف جملہ عہدہ داراں و اہلکاراں دفتر نظامت تعلیمات و صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ کا ایک جلسہ بغرض اظہار تاسف انتقال پر ملال نواب مسعود جنگ بہادر مرحوم سابق ناظم تعلیمات سرکار عالی منعقد ہوا۔ قرار پایا کہ جملہ مسلمان اصحاب سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھ کر مرحوم کی روح کو اس کا ثواب پہنچائیں اور اس کے بعد حسب ذیل رزولیوشن پاس کیا گیا۔

"عہدہ داران و ارکان عملہ دفتر نظامت تعلیمات نواب مسعود جنگ بہادر کے

اچانک انتقال پر بے حد اظہار تاسف کرتے اور خدائے غفور الرحیم سے
دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کو غریق رحمت فرمائے اور ان کے پسماندگان
کو صبر جمیل عطا فرمائے۔" اور
طے پایا کہ اس رزولیوشن کی ایک کاپی بذریعہ تار مرحوم کی والدہ صاحبہ کی خدمت میں
بمقام علیگڑھ روانہ کردی جائے۔

تنقید و تبصرہ

تجرباتی تعلیم | یہ مجلد ۲۰۴ صفحات کی کتاب جس کی کتابت و طباعت اچھی ہے مولوی حبیب احمد صاحب بی۔اے۔ ڈپ ایڈ (عثمانیہ) کی تالیف ہے۔ اردو دنیا کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئیے کہ ایسی مفید کتاب جلد منظر عام پر آگئی جس کے متعلق مغربی السنہ میں بھی بہت کم مواد حاصل ہوتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کن اصول پر کاربند ہوکر طلبا کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ان کی فطرت، استعداد، ذہنی اور دماغی قابلیتوں کا پتہ کیسے چلاتے ہیں، مستقبل کو درخشاں اور تابناک بنانے میں کس سعی اور کاوش سے کام لیتے ہیں۔ کتاب کی بروقت تالیف نے مدرسین کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کردیا ہے اور یقیناً ان کے لئے یہ ایک بہتر مشیر اور شمع ہدایت ثابت ہوگی۔ حجم کا لحاظ کرتے ہوئے گو قیمت زیادہ ہے مگر مغز کے لحاظ سے بری نہیں۔

تبسم پارے | یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مولوی حبیب احمد صاحب بی۔اے۔ ڈپ ایڈ (عثمانیہ) کے تین مختصر مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ الفاظ اور اصطلاحات مثل وضو باز، وبیز برادری نوٹ نما، مارشل لا، حفظ ما تقدم، وغیرہ وغیرہ کے موقعہ بہ موقعہ برجستہ معنی آفریں استعمال نے تحریر کو پرلطف بنادیا ہے۔ بعض مقامات پر اس غضب کا دلچسپ مذاق کیا ہے کہ انسانی فطرت کو یہ بے ساختہ گدگدیاں بے اختیار لٹا لٹا دے رہی ہیں۔
دوسرے مضمون کا، ہم نے انگریزی اور صاحب نے اردو کس طرح سیکھی" معیار اچھا ہے۔ ان مضامین کی افادی حیثیت پر نظر کرتے ضرورت ہے کہ ایسے ہی معیار کے مضامین کچھ زیادہ تعداد میں کتابی صورت میں شائع ہوں۔

مبادیات کشافہ مصنفہ جناب علی موسیٰ رضا صاحب مہاجر بی۔اے۔ وگار آر گنا ئزنگ کمشنر حیدرآباد بائے اسکوٹس ممالک محروسہ سرکار عالی۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن قیمت (عاں) مقامی کتب فروشوں سے مل سکتی ہے۔

لارڈ بیڈن پاول کی عالمگیر تحریک اسکاوٹنگ پر یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔جس میں ٹنڈر فٹ اور سکنڈ کلاس کے نصاب کی تفصیل ہے۔تشریح اور توضیح کیلئے تصاویر اور خاکوں سے کام لیا گیا ہے۔

اردو زبان میں ویسے تو اور بھی کئی کتابیں اس عنوان پر موجود ہیں مگر ان سب میں زیر تنقید کتاب بلحاظ علمی معلومات سلاست و جامعیت سب سے بہتر اور بلاشبہ اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔ زبان صاف ستھری اور سلجھی ہوئی ہے۔طرز بیان شروع سے آخر تک دلچسپ ہے۔ہمیں یقین ہے کہ اسکاوٹ اور اسکاوٹ ماسٹر صاحبان اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔بلکہ یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ اس تحریک سے ملک کو روشناس کرنے اور ہر دلعزیز بنانے میں "مبادیات کشافہ" بے حد مددو معاون ہو گی۔قابل مصنف کو ہم اس کامیابی پر دلی مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کی مساعی مشکور ہوں گی۔

داغ مصنفہ مولوی نور اللہ محمد صاحب نوری۔مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن قیمت (۱۲؍)

یہ نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی کی سوانح حیات اور ان کے کلام پر مبسوط تبصرہ ہے۔مرحوم کے حالات زندگی جس شرح و بسط سے لکھے گئے ہیں وہ کافی ووافی ہیں۔قابل مصنف نے نہ صرف اس کتاب کو داغ مرحوم کے حالات زندگی تک محدود رکھا ہے بلکہ مرحوم کی شاعری اور اصناف شاعری سے بھی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اس کے ساتھ ہی مرحوم کے اسلوب بیان، روزمرہ، سلاست زبان محاورات وامثال، کلام کی شوخی بے باکی و بے تکلفی وغیرہ پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔غرض اصناف سخن سے ہر صنف کی وضاحت میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا ہے آخر میں مرحوم کے ان شاگردوں کے کلام کا بھی نمونہ ہدیہ ناظرین کیا ہے۔بہر حال ایسی جامع کتاب آج تک ہماری نظر سے نہیں گزری طباعت بھی متوسط درجہ کے کاغذ پر نہایت صفائی اور عمدگی سے ہوئی ہے امید ہے کہ ناظرین کرام نہایت قدردانی کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمائینگے۔

افتتاحیہ

نواب سر مسعود جنگ بہادر کا انتقال

۳۰ر جولائی ۱۹۳۷ء کو بھوپال کے پبلسٹی آفیسر کے تار سے کہ "آج صبح مسعود جنگ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا" تمام ہندوستان کے تعلیمی حلقوں اور خاص کر حیدرآباد میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ اطلاع اسی روز شام کو لاسلکی کے ذریعہ نشر ہوئی اور دوسرے دن تمام مدارس اس سوگ میں بند رہے۔ اس ناگہانی واقعہ فاجعہ سے ہر چھوٹا بڑا حد درجہ متاسف اور متردد تھا۔ مرحوم کی عظیم الشان وجاہت اور شخصیت، اُن کی لسانی طلاقت اور علم مجلس کا جس کسی کو بھی تھوڑا بہت اندازہ تھا اس نے اس اچانک اطلاع کی صحت پر مشکل سے یقین کیا اور اس خبر کے قبول کرنے میں تامل ضرور ہوا۔ مگر قدرت کے اٹل قانون کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ افسوس یہ دن مرحوم کے مرنے کے نہ تھے۔ ملک اور قوم کی توقعات مرحوم سے ابھی وابستہ تھیں۔ کاش وہ اُن کی خدمت کے لئے اور زندہ رہتے۔

تعلیم و تربیت سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ بہادر) بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا، کے، ٹی، ال۔ ال۔ ڈی، آئی۔ ای۔ ایس، نامی باپ جسٹس محمود کے بیٹے اور گرامی دادا سر سید علیہ الرحمہ کے پوتے تھے۔

۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے اور باپ دادا کی آغوش میں تربیت پائی۔ قوم کے منتخب افراد نے اسٹریچی ہال میں تسمیہ خوانی کی رسم ادا کی۔ صغیر سنی میں باپ دادا کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ایم۔ اے۔ او کالج سے میٹرک پاس کر کے ۱۹۰۴ء میں راہی انگلستان ہوئے۔ نیو کالج (آکسفورڈ یونیورسٹی) سے ۱۹۱۰ء میں تاریخ میں بی آے۔ آنرز کی ڈگری امتیاز کے ساتھ لی اور ۱۹۱۲ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی۔

ملازمت تعلیم سے فارغ ہو کر بانکی پور میں بیرسٹری شروع کی مگر آپ کے ذاتی شغف اور میلان نے مجبور کیا کہ پٹنہ اسکول کی ہیڈ ماسٹری قبول کرلیں اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں وہ ریون شاہ کالج کٹک کے سینیر پروفیسر تاریخ کے عہدہ پر مامور ہوئے۔

۱۹۱۶ء میں آپ کی خدمات حکومت حیدرآباد نے مستعار لیں اور آپ نے ناظم تعلیمات کی حیثیت سے کام شروع کیا اور ۱۹۲۸ء تک نہایت کامیابی اور ہردلعزیزی کے ساتھ اس عہدہ پر فائز رہے، نواب مسعود جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور جامعہ عثمانیہ کی طرف سے ال۔ ال۔ ڈی کی اعزازی ڈگری بھی پائی ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک نواب صاحب مرحوم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور گورنمنٹ برطانیہ سے کے۔ ٹی (سر) کا خطاب پایا۔ وائس چانسلری سے مستعفی ہو کر ۱۹۳۴ء سے تا دم آخر، ریاست بھوپال میں وزیر تعلیمات کے عہدہ پر فائز رہے۔

ادبی و دیگر خدمات

نواب صاحب مرحوم کے انتقال سے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے ہندوستان کے ادبی حلقوں کو نقصان عظیم پہنچا۔ مرحوم قطع نظر خاندانی امتیاز کے زبردست شخصیت کے حامل اور تعلیمی امور میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں اُن کا دَورِ ملازمت اُن کی پوری سوانح حیات میں غالباً سب سے زیادہ درخشاں اور تابناک رہا۔

تحتانوی اور ثانوی تعلیم کی توسیع، صدر مہتمماں کی جائدادوں کا قیام انٹرمیڈیٹ کالج، ورنگل، اورنگ آباد، گلبرگہ اور سٹی کالج حیدرآباد کا افتتاح نیز زنانہ کالج نامپلی اور جاگیردار کالج کا قیام، ناظم صاحب کشافہ و صدر مہتمم ورزش جسمانی کا تقرر، غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو مرحوم کی توجہ کا رہین منت نہ ہو۔ اس گہری دلچسپی اور انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارہ سال کے اندر مدارس اور طلبہ کی تعداد دگنی ہوگئی۔ اس مختصر دور میں نہ صرف ہر جہتی ترقی تعلیمات میں ہوئی بلکہ ملازمین سررشتہ کی تنخواہوں میں معقول اضافہ ہوا اور سررشتہ کا وقار کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ اس کے علاوہ نواب مسعود جنگ نے جامعہ عثمانیہ کی تاسیس میں سرگرم حصہ لیا اور علاوہ فرائض نظامت کے ابتدائً صدر کلیہ کا کام بھی انجام دیا۔ اس لحاظ سے سب سے پہلے صدر ہونے کا امتیاز مرحوم ہی کو حاصل رہا ہے۔ تا دمِ آخر وہ مجلس انتظامی جامعہ عثمانیہ کے رکن تھے۔ نہ صرف عثمانیہ یونیورسٹی بلکہ کلکتہ اور مدارس یونیورسٹی کے فیلو اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے بھی رکن تھے۔

مرحوم انجمن ترقی اُردو کے زبردست حامی اور سرپرست تھے۔ انجمن مذکور کیلئے

حیدرآباد میں معقول رقم جمع کر کے اس کی مالی حالت استوار کر دی اور مرتے دم تک انجمن مذکور کے صدر رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلری کے زمانہ میں جب کہ عالمگیر کساد بازاری سے تمام عالم متاثر تھا، نواب صاحب ممدوح نے معتدبہ رقم حیدرآباد سے جمع کی اور دس لاکھ کا گراں قدر عطیہ گورنمنٹ حیدرآباد سے حاصل کر کے مسلم یونیورسٹی کو درجہ اول کی یونیورسٹی کا درجہ عطا کیا۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جس کی ایک شاخ انجمن ترقی اُردو بھی ہے، وہ صدر مقرر ہوئے اور فصیح و بلیغ صدارتی خطبوں سے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ جنوبی ہند کی اردو کانفرنس اور کاروئے یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں بھی مرحوم نے معرکتہ آلارا خطبے پڑھے۔ اس کے علاوہ کراچی میں چند سال قبل آل انڈیا ٹیچرز کانفرنس کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔ وہ اُردو اور انگریزی کے اچھے خطیب تھے۔ حافظ باپ کا اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا تھا۔ اردو ادب کا اچھوتا مذاق رکھتے تھے اور ہزارہا شعر نوکِ زبان تھے۔ اُن کے ذوقِ سلیم کی یادگار "انتخاب زرین" موجود ہے، جو شعرائے اُردو کے کلام کا انتخاب ہے۔ رسالہ اُردو میں گارسان دتاسی کے خطبات کا اُردو ترجمہ فرانسیسی زبان سے کر کے تاریخ ادب اُردو کی کھوئی ہوئی کڑی جوڑ دی۔

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں جاپان کے سفر کے بعد، مرحوم نے اپنے تاثرات ایک ضخیم کتاب کی صورت میں قلم بند کر کے پبلک کے سامنے پیش کئے۔ یہ کتاب بجائے خود ایک معرکتہ الارا تصنیف ہے جو "جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق" کے نام سے موسوم ہے۔ علاوہ ذوقِ ادبی کے مرحوم اخلاق حمیدہ اور پسندیدہ کے حامل تھے۔ ہر دلعزیزی کا وہ عالم تھا کہ حیدرآباد سے رخصت ہوتے وقت بے شمار ضیافتیں ترتیب دی گئیں اور بکثرت گلپوشی ہوئی۔ حیدرآباد سے گلبرگہ تک سرایش پُر کیف مناظر رخصتی کے دیکھے گئے۔ گلبرگہ اور بمبئی تک ان کی مشایعت کی گئی اور ایک یادگاری فنڈ مرحوم کے نام نامی سے موسوم کیا گیا جس سے اب تک سررشتہ ہذا کے ملازمین کی اولاد جو زیر تعلیم ہو مستفید ہو رہی ہے۔

انجمن اساتذہ سے دلچسپی | انجمن اساتذہ بلدہ اور رسالہ حیدرآباد ٹیچر، مرحوم کی حوصلہ افزائی اور عنایات کے رہین ہیں۔ اُنہی کے زمانہ میں انجمن قائم ہوئی اور رسالہ کے

سب سے پہلے سرپرست ممدوح تھے۔ انجمن کا قیام اور رسالہ کا اجرا آسان ہے۔ مگر ابتدائی کٹھن منزلوں سے گذرنا اور کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا بے حد دشوار ہے۔ حیدرآباد ٹیچر کو بھی ایسے دور سے گزرنا پڑا جب کہ اس کے حیات و ممات کا مسئلہ درپیش تھا۔ اگر نواب مسعود جنگ مرحوم کی حوصلہ افزائی اور عنایات شامل حال نہ ہوتیں تو بلاشبہ یہ رسالہ گمنامی کے گرداب میں پڑ گیا تھا۔ انجمن اساتذہ کی سالانہ کانفرنس میں بھی مرحوم نے گہری دلچسپی لی۔ اور جلسوں میں شریک ہو کر ان کو کامیاب بنایا۔ پہلی کانفرنس کے موقع پر فاقوسی لکچر جاپان کے نظم و نسق پر دیا، یہ تقریر اس قدر دلچسپ تھی کہ جنہوں نے اس کو سنا وہ اب تک اس کو نہیں بھولے ہیں۔ غرض کہ مرحوم کی ہستی قابل رشک تھی۔ اُن کا وجود اس قحط الرجال میں ایسا غنیمت تھا۔ افسوس کہ ہندوستان ایک بڑے ماہر تعلیم سے محروم ہو گیا۔ رسالہ حیدرآباد ٹیچر اس نقصان عظیم پر اپنے جذبات رنج و غم کا اظہار کرتا اور ان کے علم و فضل، ان کی ذاتی شخصیت اور اخلاق حمیدہ پر فخر کرتا ہے۔ بلاشبہ اس بے وقت موت سے قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ شرکاء انجمن اساتذہ بلدہ اس سانحہ سے سوگوار اور مرحوم کے ورثاء اور پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

A High School Composition

BY

Prof. E. E. Speight, B. A. (Oxon.),

Publishers: Messrs Longmans Green and Co.—Price B. G. Rs. 2.

Professor Speight who retired recently from Osmania University, has brought out a revised edition of his book "A High School Composition," which I reviewed last year in this Journal. This new edition is considerably improved with a view to enhance its practical value. Parts of the Grammar Section have been rewritten. The section dealing with Idioms has been recast and the chapter on Etymology simplified. A chapter on Colloquial Idioms and another on words likely to be confused have been added. The inclusion of seventeen Test Papers at the end of the book should prove particularly useful for revision work. I understand that many big centres from Karachi and Delhi to Bombay, Poona and Mysore have taken up this book to the exclusion of other text books in composition. This fact is by itself a sufficient recommendation for its adoption in other centres as well.

T. A. LINGAM.

The author points out in the preface that the three aims which he kept before him in the preparation of the atlas were:—1. to give a connected representation of Indian History. 2. to illustrate the main geographical features that have influenced the course of Indian History; and 3. to indicate the extent and importance of India's external relations and to emphasise the fact that India has never been an isolated country but 'a link in a great chain of countries"

As many as 5 out of the 20 maps illustrate the connection between India and other parts of the world. Map 1. *The Dawn of History*—explains the trade connections between the Nile, the Euphrates and the Indus river valleys, Map 8—*India and the East*—shows the penetration of Indian Civilisation to China and the East Indies and Maps 4,11, and 14—*India and the West*—describe India's relations with the ancient empires of Persia and Rome, India's contact with Islam and the changes in India's relations with the West, after the discovery of the sea route to India by the Portugese.

The distribution of the other maps is well balanced. 7 maps illustrate the course of Indian History down to 1150 A. D and 8 maps cover the 8 centuries that follow, explaining the rise and fall of the Muslim Empire, the Mogul Empire, the Mahratta power and the growth of British supremacy.

The Atlas is strongly recommended to teachers and students of Indian History. It is now being translated into Urdu and other Indian languages. These vernacular editions will be ready very shortly.

S. HANUMANTHA RAO,
(Professor of History, Nizam College).

The new scheme bids fair to be a great success in the fulness of time. Now that the Board has started its work, it may reasonably be expected that the scheme will be given effect to, at least in part, by the beginning of the next academic year

Reviews

AN ATLAS OF INDIAN HISTORY

BY

E. W. Green B. A (Oxon), I E. S. (Retired), Publishers : Messrs MacMillan and Co —Price B. G. Rs. 2-8-0.

This is a book which deserves to find a place in all school libraries. One of the reasons for the unpopularity of History as an optional subject is the faulty method of teaching. The teaching of History without maps and atlases leads to cramming by the students and produces no lasting impression on their minds.

Mr. Green has had intimate contact with Indian students for over 25 years, as Professor, as Inspector of Schools, and as Principal of the Government Muhammadan College, Madras. During that period, he worked for the inclusion of Geography as a subject worthy of study in the University classes and was also largely responsible for improved methods in the teaching of Historical Geography.

Under his guidance, Messrs. MacMillan & Co. have published a series of 6 maps to illustrate the important political changes throughout the course of Indian History. The price of the set is Rs. 32/-

For the advantage of the pupil as well as the teacher, Mr. Green has this year brought out an atlas containing 20 maps, covering the period from 6000 B. C. to 1930 A. D., with explanatory notes.

Board of Secondary Education

We mentioned in a previous issue that the scheme prepared by Mr. Fazl Muhammad Khan and the late Dr. A. H. Mackenzie for Educational Reorganisation in the State had been sanctioned by Government with certain modifications. In accordance with the recommendations contained in that scheme, a Board of Secondary Education has been set up, of which the Director of Public Instruction is the *ex-officio* President. This body consists of 28 members, including representatives of Osmania University, Education Department, and Agriculture, Commerce and Industries, Co-operative and Public Works Departments, besides representatives of Girls' Education, Aided Institutions and the public.

Sahebzada Nawab Basalath Jah Bahadur is the *Sadre-Ala*, or the Chief President, of the Board. In choosing his own brother for this important office, His Exalted Highness has given a further instance of his deep and abiding interest in the educational progress of the State. It is also in the fitness of things that a Statutory Committee of Girls' Education should have been constituted at the same time and that Lady Hydari, who has done so much for the advancement of women in the State, should be its President.

The inaugural meeting of the Board was held on Wednesday 25th August 1937 in the Legislative Council Hall under the presidency of Sahebzada Nawab Basalath Jah Bahadur. In welcoming Sahebzada Nawab Basalath Jah Bahadur, the Hon'ble Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, Education Member, made an important speech in which he indicated the policy to be pursued by the Board. In his inaugural address the Sahebzada Saheb expressed the hope that the Board would so organise the system of education in the State as to enable the pupils to earn their livelihood on completing their education. *

---

* These speeches appear elsewhere.

outstanding ability left a permanent impression on the minds of all his subordinates. He also took a leading part in the inception and subsequent development of Osmania University.

The late Sir Ross Masood left Hyderabad in 1927 to serve the institution which had been founded by his grand-father, the late Sir Syed Ahmad Khan, and the interests of which had always been dear to his heart. Thus what was a loss to our State was a distinct gain to Aligarh As Vice-Chancellor of Muslim University, Aligarh he achieved much success in improving its finances and efficiency and in enhancing its reputation. In the last few years of his life, he rendered valuable services to the Bhopal State as Minister of Education and Public Works Department. His book "Japan and its Educational System" is a standard work on the system of education in that country. He also published an anthology of Urdu verse and was a strong supporter of Anjuman-e-Tarraki-e-Urdu.

No one who came into contact with the late Sir Ross Masood could fail to be impressed by his towering personality, intellectual attainments, genial disposition and sense of humour. Indeed, he possessed a unique personal charm which attracted all classes of people to him. In him were combined the best features of Eastern and Western culture. His death is a great loss to the country. Alas! India has lost this distinguished son at a critical stage of her national development

The Hyderabad Teacher, of which the late Sir Ross Masood was the first patron, deeply mourns his sad and untimely death and offers to the members of the bereaved family its heartfelt condolences.

Editorial Notes.

The Late Sir Ross Masood.

The death of Sir Ross Masood, Nawab Masood Jung Bahadur, B. A. (Oxon), L. L. D., Barrister-at-law, I. E. S., which occurred at Bhopal on 30th July 1937, at the early age of 48 years, is a national calamity. For more than 20 years he laboured hard for the nationalisation of Indian education and the adoption of the mother-tongue as the medium of instruction in all schools and colleges. His scheme for the educational reconstruction of India was to divide the country on a linguistic basis, giving each area a university wherein the language of that area should be the medium of instruction. In a lecture which he delivered in the Senate House, Calcutta, in 1936, he said: "If India is to recapture her soul, she can only do so by developing that which is her own and not by attempting to treat as her own that which is not hers".

In H. E. H. the Nizam's Dominions the late Sir Ross Masood will always be remembered for the brilliant record of work which he left as Director of Public Instruction. The twelve years of his directorship, from 1916 to 1927, were noted for unprecedented progress in all directions. During this period the number of schools and scholars trebled, four Intermediate Colleges were opened, more adequate and efficient arrangements were made for the training of teachers, commercial training and scouting were introduced and physical education was developed. Besides, he raised the prestige of the Department and secured for the teachers a status which they had never enjoyed before Still more remarkable was the moral influence which he exercised over the Department: his kindness, sympathy, impartiality, keen sense of justice and

our children in the national vernacular. Thus Hyderabad was able with the help of its Government to give a lead to the rest of India by founding the Osmania University.

Education and Unemployment

Education ought to show the people the ways and means of earning their livelihood. It is the recognition of this duty by Government that led to the constitution of this Board. Feeling the need for vocational training, that is, instruction in commercial industrial and technical subjects, side by side with literary education for the children, the Board has emphasised the importance of its inclusion in the curriculum. Very soon I hope to see these ideas of ours put into practice. To-day the world is haunted with the spectre of unemployment, and though it has not assumed a grave aspect in these Dominions yet, it is feared that if precautions are not taken it may soon face the coming generations. It is our duty to adopt beforehand such preventive measures as will enable future generations to combat this evil successfully.

Women's Education

In conclusion I am happy to observe that the question of Girls' Education is also under careful scrutiny and a Special Committee with Lady Hydari as President has been constituted. She is well-known for her learning, and just as her husband the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Hyder Nawaz Jung Bahadur, has endeavoured to found and develop the Osmania University, so Lady Hydari is devoting her energies to the cause of Women's Education. We are sure that her interest and efforts will go a long way towards the solution of the important problem of Women's Education.

learning was the monopoly of the Monks and the Barons. But religious difference and the invention of printing freed it from these shackles. In India also similar conditions prevailed when learning was confined to the Brahmins. Thus in Europe and India it had assumed a religious form and these sects depended on it for their existence. The Monks used to copy and sell books and the Brahmins held the monopoly of religion and statecraft. In Europe learning was emancipated from religion, but in India it only changed the restrictions of one religion for those of another Gautama Buddha and Mahavira Jain freed education from the hands of the Brahmins. Both were, however, founders of religions and education could not become common On the other hand, it did become common in the West. To-day all Governments in Western countries believe that national salvation can come only through preparing the children for the tasks of life The object of this kind of education is first to make them worthy men and then to teach them the means of earning their livelihood. Though India and other Eastern countries have kept the same objectives before them, yet the general public has other aims in view, and regards education solely as a stepping stone to lucrative jobs. This mentality has been in existence for a very long time due chiefly to the fact that education in this country was at first a case of privilege. Then when the Moghuls established their power, the inhabitants learnt Arabic and Persian with the sole object of earning their livelihood which they were able to do successfully. When the British rule began with the administration of the East India Company, the people continued to follow the same ideals, and when our country thought of spreading education among the masses, it only imitated other countries. Schools and Universities were started with a foreign language as the medium of instruction. The general mentality remained practically uninfluenced and the people considered the mere acquiring of the knowledge of the language of the rulers quite sufficient. The only way to remove this defective ideology was to educate

before us will be easily solved and Hyderabad will make a name for herself in the world in the sphere of educational progress and reform.

Inaugural Address

BY

Sahebzada Nawab Basalath Jah Bahadur.

(Translated from Urdu)

Nawab Mahdi Yar Jung, Lady Hydari and Gentlemen:-

I am indebted to Government for having appointed me the Chief President of this Board and thus afforded me an opportunity to serve the Ruler and the State. I have already been connected with the Education Department since my recent appointment as President of the Jagirdar College Board.

I take this opportunity to thank Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, Education Member, for his kind references to me. He is well-known for his learning and has served these Dominions in various capacities. He has also had occasion to serve in the Education Department in British India. His interest in the activities of the Education Department and his love of learning are obvious. He has inherited these from his worthy father, the late Nawab Imad-ul-Mulk Bahadur, who was for a long time associated with the Education Department. It is thus a happy sign that he holds the portfolio for Education.

This Board is concerned with the objects of education and the objects of education have been the same in every country and in every age, though the methods of education undergo changes from time to time. History teaches us that at first education was the special privilege of a sect or caste. Take for instance, the Medieval Ages in Europe when

is not confined to education only but covers all those matters which relate to the welfare of Hyderabad women. I have appointed under her two ladies. One is Miss Pope, whose College has produced splendid results, and the other is Mrs. Engler who was our Chief Inspectress and who possesses wide experience. The Ladies' Committee will deliberate separately and will be convened wherever Lady Hydari may desire. Mr. Ali Akbar, Secretary of this Board, will be present at its meetings The decisions arrived at will be conveyed to me through the Director of Public Instruction personally, instead of through official correspondence I am confident that through this Committee a great impetus will be given to women's education. The greatest need to-day is a revision of the curriculum for girls, e. g., more emphasis should be laid on sewing, cooking, domestic science, etc. Their games too should be different from those of boys.

Before finishing my speech, I wish to say that nothing can be achieved without co-operation. Until the Education Department and other departments join hands and work unitedly, we cannot succeed in our aims.

Gentlemen, a feature of this Board is that representatives of the public have been included in it so that non-official advice may be obtained. On the other side, we have on it officials who belong to other departments, so that they may assist us in the scheme before us so far as it affects their departments.

In the matter of education, we have yet to achieve much. At present Primary Education is being imparted free in our State. Efforts are being made in British India to make it compulsory. The Government of India have compulsory education as their ultimate goal. But I cannot say anything more on this subject because the President of the Council is shortly going to make an official declaration of our policy in this regard. The field of action that lies before you is therefore considerably wide and I hope that with your combined efforts the highly difficult problems

School Leaving and Matriculation systems and enforce instead the two examinations referred to above, i. e., the Ninth Class and the Twelfth Class examinations. Only one problem remains now, the problem relating to the Nizam College, which is affiliated to the Madras University. Government have decided that for the present it will continue to be affiliated to the Madras University. We shall therefore have to prepare some students according to the old system, so that they may be admitted to the Nizam College. To this end I propose to set up an examination by the name of "The Nizam College Entrance Examination", the medium of instruction for which will be English. This examination will be conducted under our Board and only a few selected institutions will be permitted to prepare students for it.

Gentlemen, nowadays conditions are such that when the new academic session opens hundreds of students flock to the Osmania University and the Nizam College and a large number of them have to go back disappointed. The examination proposed to be set up for the Nizam College will be exclusive for a few institutions only. The new scheme is expected to be so interesting as to attract a large number of students. It will meet almost all their requirements and will prove a boon to such of them as do not possess literary ability. As only capable students will join the University, its standard will be raised and only those qualified for admission will be taken into the University.

Women's Education

The present condition of Women's Education is not satisfactory. There were no lady inspectors for some years. Consequently, certain Girls' Schools existed in name only, while others lacked proper staff and equipment.

It is a happy augury for the future of Women's Education that Lady Hydari has been appointed President of the Committee for Girls' Education. Lady Hydari's interest

tendencies of students and to discover to which kind of training their minds are inclined. The fundamental principle of this scheme is bifurcation. At the end of the 9th year & 12th year of education, vocational education will be imparted to students with a practical bent who are not likely to derive benefit from higher academic studies. The organisation of this technical education has been entrusted to Mr. Fazl Mohd. Khan whose duty it will be to arrange for the necessary training. As we cannot establish institutions for all the various industries, it is necessary for the Departments of Agriculture, Commerce and Industries, etc., to co-operate with us in our task.

The existing drawback is that there is more supply of educated people than the actual demand. One advantage of the co-operation of these departments will be to assess the exact demand for various Mulki industries, such as paper manufacture, sugar manufacture, tannery, etc. Consequently, steps will be taken to train the commensurate number for the purpose. Although it is a difficult task, I am confident of its success in view of the ability and untiring zeal of Mr. Fazl Mohd. Khan. Like Primary Education, Secondary Education will also be made more interesting and efforts will be made to make it fulfil our actual needs. University Education will be reserved for such pupils only as are capable of receiving it. Evidently their number will be limited and only good brains will get the chance. Besides Government service, other avenues of employment will be opened for educated young men.

According to the present arrangements, there are two prevailing systems of Secondary Education. One is the Osmania Matriculation and the other the High School Leaving Certificate. This dual system has been responsible for the division of our attention and energies. Now that the Madras University has recognised the Osmania Matriculation, there is no need to continue here the Madras system. It is therefore proposed to abolish both the High

Enforcement of Mackenzie Scheme

Gentlemen, the educational system of not only this State but of the whole of India has been such that people after finishing their education become no useful members of society. The aim of every student is to serve as a clerk in some office or other after completing his course. In other words, the aim of education has been merely intellectual. As it was not intended for industrial and agricultural occupations, its natural outcome has been general unemployment and economic stress. It first occurred to our present President of the Executive Council, the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, that this defect in our educational system should be removed. In the Address he delivered in Lahore at the Punjab University Convocation, he was the first person to suggest on what lines a reform should be carried. As a result of this the Mackenzie Committee was appointed in this State. Two members of this Committee, the late Dr. Mackenzie and Mr. Fazl Mohd. Khan, after great deliberation and recording of evidence, prepared a scheme, which has resulted in the formation of this Board. It is for the Board now to consider how the scheme should be enforced. I have not got sufficient time at my disposal to dilate on the findings of this Committee. I may, however, briefly point out that the present period of ten years of school education will be extended to twelve years, including the five years of Primary Education. The object of this step is not merely to increase the period but to effect reform in education itself. For instance, Primary Education will be made more interesting and will also be adapted to meet ordinary requirements. Interesting methods will be adopted, e. g., the Wireless and the Cinema will be utilized for the purpose. Similarly, to fulfil general requirements, courses in hygiene and agriculture, etc. will be included in the curriculum. Middle School and High School education will cover four years and three years, respectively. It will be the duty of teachers in the Middle School stage to watch the

Inaugural Meeting of the Board of Secondary Education. *

Speech by the Hon'ble Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, M. A. (Oxon), Political & Education Member.

(Translated from Urdu).

Nawab Basalath Jah Bahadur, Lady Hydari and Gentlemen:—

On this occasion I am speaking in Urdu because it is the official language of our State and the work of the Board will be conducted in it.

Tribute to Prince Basalath Jah Bahadur

It is difficult to recount the benefits which His Exalted Highness has conferred on his State and his subjects One of them is his keen interest in educational matters. The formation of this very Board which came into being under a Royal Charter is itself a proof of His Exalted Highness' concern in this regard. After the establishment of this Board he was pleased to appoint his brother Sahebzada Nawab Basalath Jah Bahadur as its Chief President. I can say from personal knowledge that very few people evince so much interest in education as does Sahebzada Nawab Basalath Jah Bahadur and that he is always keen on extending his information about educational matters. He takes an active part in the deliberations of the Jagirdar College Board and is not a nominal Chairman of it. He has his own views about all matters. He grasps all the points and even offers suggestions to the Board. Recently he has made a personal inspection of several educational institutions and the views which he has expressed about them are very sound. It is our good fortune that he has been appointed as our Chief President.

---

* This was held on 25th August, 1937, in the Legislative Council Hall, under the presidency of Sahebzada Nawab Basalath Jah Bahadur, Chief President of the Board.

parallel scenes that may be familiar to them. For the rest the commentator should be scrupulously out of the picture. The other set of poems should be mainly of the eighteenth century type, elegant, rhetorical and narrative. Here the teacher should draw the attention of the students to all the graces of the language, the subtle turns of phrases and the happy and inevitable expression of thought. The mechanism of English poetry is visible here, and open to inspection. The poems of the other set, on the contrary, are like organisms whose working is deep-seated, to dissect which is to destroy.

What I have said thus far applies to the teaching of poetry in the school and in the pre-graduation classes, during the period when the students are brought for the first time in contact with great literature. Later in their lives, in the full maturity of their powers, they may have to exercise critical analysis and judgment on all classes of poetry. They may perhaps labour for years on the etymology of a word or the associations of a phrase in Shakespeare. But then it would be a labour of love, and would not be destructive of the enjoyment in poetry. But in the impressionable age of the student, it is of the utmost importance to keep alive in him the sense of delight in literature in general, poetry in particular. He must go to it with pleasure and derive from it the highest benefit and enjoyment.

When we remember the great and noble functions that have been attributed to literature by De Quincey and Arnold, we gasp in wonder at what literature has been made into in our colleges and schools—the hand-maid of the grammarian, or, at worst, the food for the vultures and harpies of commentators to feed on. I believe it will be possible, by properly directing the method of teaching, and by a judicious bifurcation of the curriculum of poetry, to preserve the æsthetic and emotional appeal of the best that is in poetry and also to give an idea to the students of the technique and formal excellence of English verse.

This naturally cannot satisfy the needs of our English syllabus or examination. It is far too vague and intangible. I suggest therefore that poems of this category should be prescribed for reading only, and differentiated from others that are for detailed study. For the latter I should prefer the kind of poetry that is as little subjective as possible, poetry that is not of the highest imaginative kind or emotional value, but which has all the formal beauties of fine verse. I feel that the poetry of the eighteenth century eminently satisfies these requirements, and it is a pity that our compilers do not show a preference for it. We are still far too much under the sway of the romantic tradition. Eighteenth century poetry provides us with precisely the kind of work that we need for class teaching. Compared with purely lyrical poetry it is more of a mechanism; its parts are easily perceived and analysed, and can be put together again without much loss of beauty. Take, for instance, a poem like 'The Deserted Village' or parts of Cowper's 'Task' or even Gray's 'Elegy'. They are admirable for explanation and verbal jugglery within the class-room. There is not that rich suggestion, reminiscence and purely spiritual atmosphere which we find in romantic poetry, and which no teacher can annotate and convey to the students. Eighteenth century poetry is exact, definite and tangible. At the same time it has all the music and grace of English language at its best. In fact, it may be said that for sheer mastery of the language few romanticists equal Dryden or Pope.

I would therefore throw out the suggestion that our curriculum of English poetry should contain two sets of works. One set of poems, largely lyrical and subjective, may be prescribed for reading only. In teaching this we should be careful not to say too much by way of commentary. Only the bare introduction of the subject, the suggestion of the background and the atmosphere of the poem should be supplied. We should stimulate in the students a state of mind similar to that revealed in the poem by recalling

being strange, the teaching of English poetry is inclined to become specially mechanical and dull among us.

There is again the consideration that the best of poetry is largely part of the self of the poet: it is the innermost longings of his heart, the most intimate experiences of his being. Clothed in his own words, moulded by his own genius, it is a thing of art to be appreciated by sympathetic understanding, by the projection of our spirit into the poet's experience. It would seem a sacrilege to violate the privacy of such personal expression with the heavy blundering instruments of annotation, analysis and grammar. Poetry of such a nature is to be entered with bated breath; it is to be enjoyed in silence. Take for instance these well-known lines:

A slumber did my spirit seal.
I had no human fears.
She seemed a thing that could not feel
The touch of earthly years.

Can explanation and commentary do anything but ruin the perfect Grecian beauty of the poem? All that a teacher might do is to suggest the background of the poem, the situation that gave rise to it, and for the rest the poem should speak for itself. "The words of Mercury are harsh after the songs of Apollo". The study of poetry is an experience, not an exercise. Its beauty sinks into us through our emotions and our intuition. It cannot be dinned into us by the labours of plodding pedagogy.

This obviously applies to the class of poetry which is lyrical and subjective–the class of poetry which seems to be very much in fashion in our text-books. I do not suggest that the commentator is wholly unnecessary in studying poetry of this type. My point is that in teaching it we have to be as unobtrusive as possible. Our task is to tune the minds of the students to the required pitch, and then allow the poet to speak for himself.

Romans, Countrymen, lend me your ears"; and he began by saying: "Mark Antony is not asking the audience for a temporary detaching of their aural appendages, but merely requests them to turn them to him for a short time". Rest in peace, ye Shades of Theobald and Malone, and the host of Shakesperean critics! Here is a genius worthy of your throne! But this is indeed an extreme example, and fortunately very rare. Still, the normal method has necessarily been one of laborious explanations, commentary and grammatical and verbal disquisition which take away the bloom from the face of a literary work.

In our country this problem in the teaching of English poetry is specially intricate, because we teach it not only for the understanding and appreciation of a work of art, but as a means of acquiring proficiency in a foreign language. For this latter reason, it becomes necessary to dwell on the linguistic, grammatical and the purely formal part of poetry which often leads to the murder of the higher æsthetic values of the work. Besides the language being foreign, the images, suggestive reminiscenes and descriptions may also be strange. I admit that there is a certain element in life and nature which is common to all the world, and is part of our inheritance. But much that is best in literature is peculiar to the land and the life in which it grows, and therefore is almost entirely lost to a stranger. For instance, when an English boy reads the lines describing the daffodils, which compare them to the stars:

Continuous as the stars they shine
And twinkle on the milky way,

the picture and the beauty of it are familiar to him immediately, and he visualizes the golden stretch of flowers tossing in the wind. But to those of us who have not even seen a daffodil it has precious little meaning, and we have to make the best we can with our explanations. The language being foreign and the images and suggestions

Appreciation of Poetry

BY

V. S. Krishnan, B A. (Oxon)

Lecturer in English, Osmania University.

The purpose of this paper is to indicate, in a perhaps disjointed fashion, a problem that arises in the teaching of English poetry in school and college classes. It is a common experience of all teachers and students of English that the books one studies are rarely, if ever, the books one enjoys. Even the irrepressible 'Q' finds that the recollection of his early text books of the school-room is akin to remembering an old malady. The intensity of this impression is often so great that it lasts a life-time; and a man cannot think of 'The Merchant of Venice'. or the poem, 'We are Seven', without a sense of revulsion. Why do the gems of literature beget in us this perverse reaction? By what counter-alchemy does the pure gold of poetry turn into heavy lead in the unfortunate hands of the teacher? Shall the text-books be for ever considered 'pest-books' by those who have to study them?

Personally I feel that there is something in the association of ideas. The not very pleasant emotions of the school-room, the dread of examinations and the rigour of the classes, when recollected in tranquility, might impart some of that unpleasantness to the books and lessons associated with them, and render them and the other implements of education unpalatable. But this does not seem to me to be the major cause. It is perhaps in the method of teaching that the real trouble lies. The teacher walks with a surgical knife into a world of beauty. He dissects, analyses, explains. He is full of syntax, etymology and split infinitives. And the final result is that a thing of beauty becomes a soporific. I recently heard of an extreme instance of pedagogic ingenuity, for the authenticity of which I cannot wholly vouch. The commentator was explaining the line: "Friends,

merciful' is an adjective clause which qualifies the noun, God, has not only no idea of the meaning of the word 'qualifies' but is guilty of impiety and an unpardonable lack of sense. For is it not both presumptuous and preposterous to ask '*which* God will forgive our sins?' instead of *why* should God forgive our sins?' when we believe only in one God?

Between a boy whose English is good but whose grammar is shaky and a boy whose knowledge of grammar is sound but whose knowledge of English is nebulous, I would unhesitatingly vote for the former. I do not concede for a moment the position that to know grammar is to know English or its converse, that *not* to know grammar is *not* to know English. For it is well to remember that our English, however good, is at best only second-hand and that even the best of English writers are guilty of occasional lapses of grammar. Nevertheless it is they who have brought into existence hordes of grammarians while not one grammarian has managed to grope his way to literary fame. Language has higher purposes to serve and higher ambitions to realise and it is the part of grammar to subserve language and not to deflect it from those higher aims and aspirations.

in mind is that in teaching grammar the meaning—*the sense*—is all important and the importance of the *form* comes only next. Let me illustrate this by taking two sentences:

1. When I entered the school this morning, the bell began to ring.

2. I entered the school this morning when the bell began to ring

The first sentence is complex because the clause beginning with 'when' is an adverb clause The second is a compound sentence because the clause beginning with 'when' is a co-ordinate clause *when* having there the force of '*and just then*'

Let me take two more sentences:

3. I met my friend in Secunderabad who was leaving that day for Bombay

4 God who is all merciful will forgive our sins.

In sentence (3), the clause beginning with the relative pronoun is a co-ordinate clause for 'who'='and he' It is therefore compound In sentence (4), the clause beginning with the relative pronoun is an *adverb* clause because 'who' there has the force of '*because He*'. The sentence is complex and it may be recast thus:

God will forgive our sins *because He* is all merciful.

[Vide Nesfield Grammar Art. 134 Note and Art 284; or consult any other authoritative source].

I have known teachers of English treating a clause similar to the one occurring in sentence (4) as if it were an adjective clause but still holding that the English of their boys is weak *because* their knowledge of grammar is weak! To my mind a boy who could write sentence (4) is all right in English but a boy who says that the clause 'who is all

teaching we should aim at improving their composition. Under grammar so called, they should study parsing, analysis and transformation of sentences which includes synthesis, direct and indirect narration, active and passive voice, degrees of comparison etc. I cannot enter into details of the methods appropriate to the teaching of grammar for that is not the subject of this article. But (*I trust*) I may indicate briefly the lines along which the work may proceed on the *concentric plan.*

The following order is suggested in dealing with certain topics :

Parsing : Noun-*pro*-noun, noun-equivalents,
Verb-*pro*-verb, auxiliary verb, (the tenses should be handled on the basis of common-sense).

The Articles, Adjective and Adverb.

Preposition, Conjunction, Interjection —its position and function,

Phrases · Kinds of a phrase which does the work of a noun is a noun-phrase etc, special types.

Clauses Similar to phrases, co-ordinate clause, parenthetical clause etc

Analysis · (1) of a simple sentence (2) of a compound sentence without subordinate clauses (3) of a complex sentence and (4) of a compound sentence with subordinate clauses

Transformation of Sentences : This is really very interesting work. In the course of the prose lesson word-building should be attempted. The meaning of a sentence should be brought out, wherever possible, by using the noun, adjective, verb, and adverb forms of the same word. Appeal to commonsense should be made, more especially in dealing with degrees of comparison. In doing exercises on the change of voice, boys should be definitely told that in English *as a rule* the active form only is used

It is clear from this that the requirements of the examinations are not in conflict with or in excess of the demands of the language. The essential point to be borne

nor asserting that this book is an authority on grammar, though for the scientific treatment of the subject and certain other interesting features it is certainly without a rival.

Having disposed of the preliminaries in this way, I should record a remark that it will be preposterous to try to make a boy see how a sentence is grammatically incorrect or without a flaw when he cannot write or recognise a sentence free from flaw. Grammar should be begun only in Form I or II after the boys have reached the analytic stage. To force it on them earlier for fear that they will not learn it otherwise will be like inoculating babies with disease to save them from catching it by accident. I should further like to draw attention to the fact that English is an idiomatic and irregular language and there is not much of grammar in it Even the few rules of grammar are washed away by numerous exceptions. Moreover usage is supreme and it over rides everything else. There are so many words found in modern dictionaries which no person having any language sense will think of using.

It is no doubt a legitimate complaint that as matters stand at present there are few books which make an appreciable correlation between text and grammar possible. Therefore if a teacher depends entirely upon the reader, his grammar teaching is bound to be disorderly and haphazard. For it will be wrong to expect the order in which new words, phrases and sentences occur in the Reader to correspond with the order in which they occur in the grammar course. *But still the inductive teaching of grammar is quite possible.* A judicious blending of the good points both in the old and the new methods will secure naturalness and method and save grammar from being looked upon as a secret cult.

Broadly speaking for examination purposes boys have to know paraphrase, precis writing, paragraph structure and punctuation. All these belong strictly to what is called, 'composition'—oral and written—although right through our

the words *child, house* and *morning* was in the sentence, *A child came to my house this morning.* The boys gave the answer all right but not one of them was able to support his answer on the strength of the definition which he had crammed in the lower classes. The boys knew intuitively that the three words were nouns and saw probably also for the first time that instead of the definition helping them, it betrayed them in a moment of need. For neither of the words—child, house or morning—is the *name* of a person, place or thing *in a narrow sense.* In his Grammar Dr. Sonnenschein cites a bewildering definition of the pronoun *theirs* which he found in a book published recently. In this book *theirs* is defined as a *'semi-predicative post-adjunct!'* One is forced to observe polite forbearance at such literary monstrosities. So much for definitions, old and new.

If we turn to nomenclature, we are faced with Stygian darkness. Says Dr. Sonnenschein, Chairman of the Joint Committee on Grammatical Terminology :

"There is a multiplicity of terms, even for grammatical relations about the nature of which there is no real difference of opinion, as, for example, those seen in the italicized words in 'John is *good,*' 'This is *John,*' 'I admire *John,*' and 'We made John *president.*' For the first of these there are 9 different names in twenty-five of the English grammars in use in the United States to-day, for the second 10, for the third 7, and for the fourth 18. Thus 'good' in 'John is *good*' is variously called, according to the grammar used, *attribute complement, predicate adjective, subject complement, attribute complement or predicate adjective, subjective complement, complement of intransitive verb, predicate attribute, adjective attribute,* and *predicate.* The result of such a state of affairs is almost hopeless confusion to the student as he takes up a new text in passing from year to year or when a new book is adopted, or when he changes his school."

With due deference to the champions of orthodox grammar, I should request them to get out of this maze as quickly as possible. This they could do only when they read and follow strictly in their classes the grammatical terminology recommended in Sonnenschein's grammar, the authoritative and up-to-date book for this purpose published by the Oxford University Press. But I am neither suggesting

This method was objectionable, as it prevented the enjoyment of poetry. It aimed at treating grammar as a synonym of prose, poetry and all! A system more flatly opposed to the modern demand for a sound teaching of grammar could hardly be conceived. The consequences were naturally appalling. The boys were led to imagine that grammatical work was arbitrary and unreal, whereas in reality the study of the operations of the human mind as reflected in language is as interesting as the study of natural phenomena.

Definitions formed the starting point of grammar teaching just as grammar itself formed the beginning of English teaching. The boy should say: 'an adjective is a word which *qualifies* a noun etc.,' and 'an adverb is a word which *modifies* a verb etc.' If a boy through inadvertence were to say that an adverb is a word which *qualifies* a verb etc., he was in for trouble The outraged teacher would not be content with mere threats but invoke divine displeasure on the head of the unfortunate pupil But no sensible teacher of English who has some acquaintance with modern methods of teaching grammar would dream of exercising his pupils in the use of the two words 'qualify' and 'modify' in this manner. On the other hand, he would say that an adjective is a word which qualifies a noun etc., and point out that an adverb also is another *qualifying* word but that it qualifies a verb etc. (vide Sonnenschein's "English Grammar"). This much for the old definitions.

Certain definitions found in grammar books published in recent years appear to be rather defective even from the grammarian's standpoint. To take a few examples: 'a verb is a word which says something about a *noun*...' Why it should be only a verb and not an adjective is difficult to see considering that a verb and an adjective both say something about a noun. Then again, 'a noun is the *name* of a person, place or thing.' Recently I asked the students of the Eighth class in my school to say what part of speech each of

elegant English could be acquired only by closer association with eminent authors and not by a worship of the grammarians or by a slavish loyalty to the rules of grammar. An object once loved may no doubt be held sacred. But certainly in matters of love coercion has no place. And it is only a barbarous piety which crowns its victim with flowers before its sacrifice Moreover the essence of a thing should not be made to depend upon its worthlessness. Earl Baldwin made a remark recently that Democracy is two years behind the Dictators. We are rather forced to admit that the schools are at least 50 years behind the world outside. Progress implies a dynamic state and so we should move on, instead of being content to remain where we were half a century ago.

The changed outlook at the present day is deplored by our elders who think that there is no English teaching in our schools because we have ousted grammar from them. They should realise that we have travelled far from a mechanical notion of literature. Our changed outlook is a natural development which need perturb nobody. We rightly hold that grammar should not form the starting point of language teaching. For in studying a rule knowledge only is acquired and it is only in the practice of the rule that real skill is acquired. And it may be said with considerable truth that English cannot be taught nor learnt properly unless grammar is kept in check and prevented from making unnecessary intrusions. For it is a principle of Educational Psychology that the teaching of grammar should not have the effect of diverting the attention of students from the main object of understanding the text correctly.

Now under the old method the first thing a candidate had to do as soon as a poem was shown to him (*shown* because there was not much of reading: the emphasis on the active side of language study was the result of a revolt against the traditional method and it came in only with the Direct Method) was to put every verse in prose order!

kind. We are now better off in a sense. We have several books in the market though most of them are ill-suited as text books for class study.

Not having many useful books to interest them or to give them an adequate idea of the beauty of form or emotional effect the students of those days must have had plenty of leisure which they spent or mis-spent in practising many difficult but quite unnecessary feats of grammatical gymnastics. Grammar was their stronghold where they were unassailable In fairness to them it must be admitted that they were able to write sentences which were free from the grammatical blunders commonly made by the present generation. They also made good platform speakers though, perhaps, as far as pronunciation and intonation are concerned, persons of the type of the Rt. Hon'ble Srinivasa Sastri or Mr. C. R. Reddy were rather an exception than the rule Their style was rather pedantic. The reasons for it might have been many. They were familiar chiefly with the writings of the 18th Century authors and, among the 19th Century writers, of Sir Walter Scott. One may say with some assurance that they showed no great mastery of the idiom, grace or ease of the language. A failure to have a correct grasp of these is apt to betray a person sometimes into writing grotesque and comic sentences. In his book, 'The Art of Writing,' Sir Arthur Quiller-Couch says that a government servant who applied for leave urging his mother's death as a reason expressed himself in this daintily odd style: *'The hand that rocked the cradle has kicked the bucket!'* Another book records how the line *'Can'st thou not minister to a mind diseased?'* was turned by word substitution into, *'Can you not wait upon a lunatic?'*

We have now a saner idea of the purpose of grammar and a more commendable notion of language. We have come to believe now in simple and common words, in beautiful wording and phrasing, and generally in a direct way of expressing our ideas. We have come to realise that

The Place of Grammar in the Direct Method

BY

T. A. Lingam, B. A., L. T.

In my article on *Some Aspects of the Teaching of English in Indian Schools* which appeared in the April–June Number of last year, I discussed the aim which should definitely govern the teaching of English in our schools and also pointed out how the Direct Method, far from excluding or neglecting grammar, attempts to teach the essentials of grammar as part of language study with the text as the centre of instruction. For the purpose of the present article I shall take it that the teaching of grammar is essential and proceed to consider how much of it must of necessity be taught for the correct understanding of the language as well as for meeting the requirements of the H. S. L. C. and the Osmania Matriculation Examinations. I shall endeavour to show that the requirements of these examinations are neither in conflict with, nor in excess of, the demands of the language and that if our boys fail to stand a test in grammar their poor performance is to be set down, partly at any rate, to a defective handling of the Direct Method or to an attempt at measuring their ability in grammar by a crude and outworn standard.

Even as recently as the beginning of this century such books as 'Readings in Poetry,' 'Walton's Paraphrase and Synthesis' and 'Sheppard's Manual of English Grammar' held undisputed sway in the English classes. No text-books used to be prescribed in those days. I have heard people say that one of the most eminent Hindu judges of the Madras High Court, now deceased, had read over 80 times Goldsmith's, 'The Vicar of Wakefield.' It must have been largely due to the charming style of the Irishman but it is likely also that to some extent it was due to the difficulties he should have met with in securing another book of the

Nuts are sold at 5 for 2 pice; how much must I pay for 55? How many can I buy for 4 annas? Send a boy to the "Post-Office" to buy a number of cards at 2 pice each, stamped envelopes at 4 pice each, reply post cards etc. and ask him how much change he will have out of five rupees. Let him do it and let others help him; one selling the stamps etc., and another giving change This entails a little trouble beforehand but it is abundantly worth while.

In the lower classes, it is a good plan to spend a lot of time measuring objects, heights and distances, first in the class-room and later in a hall or, better still, outside in the compound. First let the boys guess the height of a window (after they have had some practice in drawing lines of a given length of a foot, an inch, etc.). Let them measure the length of their own stride, the teacher's stride, etc. Then let them compare the heights of a boy and the teacher; mark the heights from the ground on the black-board and let two boys measure them accurately. Then write the two measurements on the board and let the boys find the difference. For out-of-doors measurements, have pieces of string of one, three and five yards length. Let the boys write down everything they measure and then, in the class-room, let them use these measurements and reduce them to scale. The making of plans is a very valuable and popular mathematical exercise.

My main contention is that boys must be made *to think for themselves* and not merely to remember how the teacher solved a particular kind of problem. For this reason I recommend giving as great a variety of problems as possible. And really, to a teacher who will spend a few minutes in preparation before going to his class, the variety of possible problems is almost without limit.

$\frac{1}{2}$ seer on Friday, $\frac{3}{4}$ of a seer on Saturday and $2\frac{1}{4}$ seers on Sunday when all the family is at home. What will be the cost of a week's rice at 4 seers per rupee?

Let the children buy and sell things according to prevailing bazaar practice. Rice is sold at so many seers per rupee; eggs at so much a dozen, small fruits and nuts are sold in small groups such as 3 for 2 annas, 5 for a dub etc. Very well, give such sums as the following:—When rice is 5 seers for a rupee, how much must I pay for 25 seers? $27\frac{1}{2}$ seers? $36\frac{1}{4}$ seers? etc.

These fractional parts need present no difficulty to 3rd Standard children if they learn in a practical way the meaning of them. Get a seer, a half seer, a quarter seer and a half quarter seer measure, and some grain, and let the pupils *find out by doing*, that $\frac{3}{4}$ is half of $1\frac{1}{2}$ etc. For further practice, have cardboard coins made, rupees, eight anna, four anna, two anna and one anna bits. Ask a child to give a half of Re. 1/8/0. Let him get change from another child who is "*Komatie*" and is provided with a box of small coins. Let him find different ways of giving you the change (one 8 anna and one four anna bit; 3 four anna bits etc.). This actual *doing* of division of money can be amplified of course, and will yield valuable results.

Buy a cheap balance and let children weigh things (grain or sand) and let them learn that 2 quarter pounds make a half pound, etc. So also, measuring–let them have foot rules. Try to get them graduated in eighths of inches; if you can't get them, let the children make them from stiff card. (This is a good exercise for a hand work class.) A clock face with movable hands (a watch seller will often give one that he has had for advertising purposes) is another useful aid to the teaching of fractions. Most teachers must know boys who know how to work fractions sums, first finding the L. C. M. etc. but who have no real understanding of fractions; who probably could not easily do one of the "rice" sums above-mentioned.

"Multiply 15 crores 9 lakhs and 72 by 9 crores, 5 thousand and 9." (It is not told the poor child what he must do when he has laboriously found the enormous total, if he lives long enough to complete the calculation!). I was horrified to see recently on a black-board in the *4th Standard* of a girls' school (probably not one of those girls would subsequently go to High School) the following enormity: "Reduce 957 guineas to half pence". Guineas and half pence! Why, in the name of all that is wonderful, should young Indian girls have to manipulate guineas and half pence? What presumption of *these English* to inflict their cumbersome monetary system on children of whom perhaps not one in a thousand will ever be called upon to use it! Surely we can do something better than that

Two boys are playing marbles. They have 54 marbles each. "A" loses 9 and wins 13 How many has each boy then? (It is to be hoped that the teacher realises that what "A" loses "B" wins, and *vice versa*).

A man buys 37 mangoes. 9 are bad. He sells the rest at 4 dubs each. How much money does he get?

In making bazaar problems, use prices that are approximately correct. There are 9 horses, 14 cows, 24 ducks and 15 hens in a field. How many legs have they all together? It will be a surprise to many teachers to find how few 3rd Standard boys are able to do this sum without any assistance. Of course, if assistance is given, that is tantamount to the teacher doing the thinking and the pupils doing the mechanical work, which is an evil we are all eager to eradicate. It must have come within the experience of all who read this, that boys are sometimes able to do quite complicated advanced mechanical operations but unable to solve the simplest problem because they have not had the training in mental exercise.

My mother cooks ¼ seer of rice on Manday, ½ seer on Tuesday, 1¼ seer on Wednesday, ¾ of a seer on Thursday,

The Teaching of Mathematics to Junior Children

BY

Mrs. Bessie Simpson,
Wesley High School, Secunderabad-Dn.

This is no attempt at a learned article, as I am not qualified to write such. On the contrary, I am a learner, ready to sit at the feet of anyone who has practical advice to give on this subject, and as such, I here make my contribution and, simply and directly, set down some results of my experience in the teaching of mathematics to boys of Standards 3, 4 and 5.

Mathematics is an unpopular subject, as a rule, among boys; it cannot be memorised: boys are not interested because they cannot see the use of it. And do we wonder? What possible use *can* we expect children to see in reducing 25 crores of rupees to annas, or even in dealing with crores and lakhs at all? They come outside the scope and comprehension of young people; so let us leave such enormous numbers till later.

I read the other day of an English boy who was a duffer at mathematics, hated the subject, but was very keen on anything related to engines. Then he went to a machine shop and all was changed; he saw there the need for making calculations and worked at them with a zest because of their practical value to him. That incident gives us our clue: *let us touch the imagination of our pupils*; let us show them the practical value of mathematics from the first; let us take our mathematics into the children's games and everyday life.

Of course, such mammoth calculations as I have mentioned above *have* a value—they serve to keep the class occupied while the over-worked teacher has a rest. That must be the purpose of other sums I have seen recently.

said to be "two years advanced", or "fifteen months retarded." But it was found that a given retardation was more serious in a young child than in an older child, and that it was rather the ratio of this to the chronological age that mattered. Hence the Intelligence Quotient, or I. Q., introduced by Professor Stern of Hamburg, came to be the recognized way of giving results. This I. Q. is the mental age expressed as a percentage of the actual age, so that if, for example, the child's actual or chronological age is 8 years and 4 months, and his mental age 9 years 2 months, then we have:

$$\text{I. Q.} = \frac{\text{Mental age}}{\text{Chronological age}} \times 100$$

$$= \frac{\text{9 years 2 months}}{\text{8 years 4 months}} \times 100$$

$$= \frac{110}{100} \times 100 \quad = 110$$

Clearly, from the manner of its formation, the average I. Q. is 100, which is the I. Q. of any child whose mental age is the same as his actual age. Quotients are mostly between 80 and 120, but one child in twenty will be above 120, and about one in twenty or so below 80, while some run up to 140, or even 160, and more in rare cases.

There are difficulties in connection with this I. Q. method which become more acute with older children and with adults. They arise from the fact that the mental age as estimated by the usual tests does not go on increasing indefinitely, but slows off and comes to a standstill at some age round about sixteen. This fact has led to much controversy.

dull child of fifteen. The difficulty lies in the fact that there is no absolute scale for the measurement of mental growth. Experiment finds it impossible to demonstrate a growth of intelligence (in the average man) after sixteen.

Testing of Intelligence.

In dealing with the nature of intelligence we came across two different views. For the very practical task of measuring intelligence it does not matter very much which view we adopt—Spearman's, which says that high correlations are due to the central factor "G", or Thorndike's, which maintains that it is due to common elements. In practice we have to measure intelligence by its products, and the best measures are those which measure those products in the fairest way.

Binet of Paris was pioneer, who with his colleague, Simon, published in 1905 the first scale of tests. Intelligence testing in its earliest years was mainly aimed at the discovery of lack of intelligence.

Binet's success was due to 3 guiding principles—(1) First, he took a medley of different kinds of tests, approaching intelligence from different aspects. (2) Secondly, he made no theoretical assertions about the suitability or otherwise of a given test for this or that age. (3) And thirdly, he employed the mental age scale.

Difficulty.—Children are not at all alike in their talents, and our order of difficulty of the tests is only correct on the average. In these circumstances the modern practice is to give him credit for all the tests passed. In Terman's revision of the Binet scale there are six tests per year, and a child simply gets two more months of mental age for any test which he passes.

In the early days of testing, the result of the examination was usually expressed by the difference between the mental age and the chronological age. Thus a child was

and sisters of the same family who are not twins. Again however there exists the possibility of explaining this resemblance, as far as mental qualities go, either by saying that the reason is the identity of inheritance, or by claiming that it is due to the exceptional identity of home circumstances. Researches by Galton, Thorndike, and others point to the former factor, inheritance, as being more potent. Thorndike compared twins of different ages, and found that young twins resembled each other mentally just as much as old twins did, whereas if the identity of home circumstances were the cause of resemblance, then its effect aught to go on increasing up to the time when they left home. Galton followed up cases of great mental similarity between twins, and also great dissimilarity, which not infrequently occurs. If home identity were the cause of the similarity, one would expect twins brought up in different homes frequently to show dissimilar mentalities. But in fact, in Galton's data, twins brought up in the one home were as often dissimilar as were those brought up in different homes (having been separated at birth). Their similarity or dissimilarity appeared to be independent of the environment.

In this way we come to regard—*Like tends to beget likes*—as the first great law of heredity. Illustrations of this first law are omnipresent. The truth of the law can be demonstrated by the study of any family tree. The inheritance of superior mental traits, especially those leading to scientific eminence, is exemplified in the Wedgwood—Darwin-Galton family. Their family tree has been traced by Karl Pearson for over 1000 years. Persons of great ability abound in it.

The Growth of Intelligence.

We turn now to the question of the constancy of intelligence. Many psychologists believe in this constancy. That is to say, they believe that a clever child of five will be a clever child of fifteen, and a dull child of five will be a

tell us to abolish introspection; nor, like the Berlin gestaltists, try to make us renounce analysis. On the contrary, they seek the widest measure of reconciliation. They have also drawn a line between the "general theory" of two factors on the one hand and the "sub-theories" on the other. The former proves and locates the factors, the latter attempt to explain them. Last but not least, they have linked up the factor "G" with the laws and processes of noegenesis These processes are as follows —

(1) "A person has more or less power to observe what goes on in his own mind."

(2) "When a person has in mind two or more ideas, he has more or less power to bring to mind any relations that essentially hold between them."

(3) "When a person has in mind any idea together with a relation, he has more or less power to bring to mind the correlative idea."

Some indication to the effect that these three laws suffice to measure the actual scope of "G" may readily be obtained by examining any of those tests of "general intelligence" or "general ability" which are in most common usage. This identifying of "G" with education promises to serve as a pole star to guide further advance throughout the region of individual psychology.

Is Intelligence Inheritable ?

We have tried to explain what we mean by intelligence. Let us now see whether intelligence is inherited or acquired.

Two lines of investigation which bear on the question of average ability being inherited or acquired are: (1) enquiries into the mentality of twins and siblings, and (2) researches into the constancy or otherwise, with advancing age, of the intelligence quotient. Twins are naturally more likely to resemble one another than siblings—brothers

constant for the same individual, but varies greatly from individual to individual. The second factor "S" represents the specific factor inherent in the act or performance under consideration. Even for the same individual, it differs freely from one ability to another.

In opposition to Spearman's two factor theory we have that of Thorndike's, which maintains that a person's total intelligence is made up of a large number of specific abilities, not bound together by a common factor. Thorndike supposed that there were several common factors, each common to different kinds of operation.

Investigations support the view of Spearman. They show that an individual's performance in any test is due partly to a factor common to all performances (the general factor, or general ability) and partly to a factor specific to the test itself.

Justification of Spearman's Theory.

It seems that this theory has had to suffer from misrepresentation The common misconceptions of the theory of factors are, that it can concern only those psychologists who are profound mathematicians, that it is not in accord with the various sub-theories; that the factors possess little or no positive content; and that they are something indescribable, or even meaningless.

These fallacies can be rebutted by the following facts :-

For the purpose of ordinary work, the mathematics required by the psychologist to understand and utilize the chief findings of the theory of factors are no more than what should be possessed by every normal child before he or she leaves school.

Whilst the other schools have been essentially destructive, the two factor theory has remained almost wholly constructive. Its followers do not, unlike the behaviourists,

Besides these varied definitions we have to take into consideration two wide conceptions of intelligence. The meaning of intelligence in comparative psychology is the plasticity of behaviour which contrasts with the mechanical behaviour of pure instinct. Its meaning in the history of mental tests is the general capacity which varies from individual to individual, and is measured in intelligence tests Inspite of differences, we notice that there is a great deal in common between the two conceptions as one may readily see by comparing the definitions which have been given, and that the two conceptions of intelligence have as common factors the general ideas of plasticity of behaviour and purposiveness.

Intelligence is the product of the healthy functioning of the central nervous system. If a person has a nervous system which integrates easily and tenaciously, he is likely to be bright and intelligent If, on the other hand, his nervous system forms neuron paths with difficulty, if associations are hard to form and are soon lost, he is certain to be dull and stupid. Specific training, of course, is needed to form the connections, but the learning is easy if there is good nerve material to work upon This way of locking at intelligence reconciles the views of Spearman and Thorndike. The general factor is the inherited state of the nervous system, but the relatively independent traits need specific training. Thus, so far as education is concerned, intelligence and capacity to learn are practically synonymous terms.

Spearman's Two Factor Theory.

In 1904 Spearman printed a paper in which he stated that "all branches of intellectual activity have in common one fundamental function (or group of functions), whereas the remaining or specific elements seem in every case to be wholly different from that in all the others." These two factors are now labelled "G" and "S". The factor "G" represents general ability or general intelligence. It is

fied innate pattern reactions are rare. The characteristic feature of human life is to be seen in the extent to which its instinctive behaviour-tendencies have been modified, giving rise to the complex, varied and discriminative behaviour which we call "intelligence".

Human Intelligence.

So far we have learned that there is such a thing as "intelligence" Moreover, it is not confined to human beings, but is found in animals as well. But when we come to define intelligence, we are at once encountered by its evasive nature. We come across numerous definitions given by eminent psychologists, and are at a loss to find out the one which hits the mark. An idea of our difficulty can be had from the following definitions of intelligence as given by psychologists of note.—

WILLIAM JAMES: Intelligent behaviour is characterised by "the pursuance of future ends and the choice of means for their attainment."

BINET says that he is attempting to measure in his intelligence tests: (*a*) the tendency to take and maintain a given direction, (*b*) the power of making adaptations for an end, and (*c*) self-criticism.

THORNDIKE distinguishes three types of intelligence: (1) mechanical intelligence—the ability to learn, to understand and manage things and mechanisms, (2) Social intelligence—the ability to act wisely in human relations, (3) Abstract intelligence—the ability to understand and manage symbols.

TERMAN—Intelligence is the ability to think in abstract ideas.

The Nature of Intelligence

BY

Ghiasuddin Ahmed, M. A., LL B (Alig.), Ed. B Hons (Glasgow).

(Lecturer, Teachers' Training College)

Instinct and Intelligence.

Humanity has in course of time had to endure from the hands of science a great outrage upon its naive self love. The biological research robbed man of his peculiar privilege of having been specially created, and relegated him to a descent from the animal world, implying an ineradicable animal nature in him: this transvaluation has been accomplished at the instigation of Charles Darwin, Wallace, and their predecessors, and not without violent opposition from their contemporaries.

Thus the age-old supposition, that human and animal behaviour were essentially different in their natures, human conduct being solely directed by the higher faculty of "reason", while that of animals was directed by "instinct", has come to nothing That animals too have intelligence has been proved by Professor Kohler's work with chimpanzees He maintains that their behaviour is not wholly and solely directed by impulse and instinct but that they show insight if they meet with novel situations in their environment.

But before going any further, it is imperative to keep in mind two broad distinctions between human and animal behaviour. In the first place, there are limits to the apes' power of intelligently appreciating the elements in an environmental problem, and that they show limitations also in their powers of perception, whereas man's intelligent behaviour is free from such limitations. Secondly, though the animals show insight in certain situations, yet the greater part of their behaviour is composed of unmodified innate pattern reactions. Amongst human adults, unmodi-

and foreign pupils by arranging for the exchange of individual pupils and sometimes of a whole class. A similar Bureau might be formed in India to arrange for the exchange of pupils belonging to different parts of the country.

With a view to giving an impetus to extra-curricular activities in the schools at Hyderabad, the Hyderabad Teachers' Association appointed a committee in 1935 to prepare a report on the subject. The report produced by the Committee contained many valuable suggestions. One of them was that a bureau should be established by the Association which would act both as a clearing house for ideas and an advisory board for schools regarding extra-curricular activities. It is now nearly a year since the proposed Bureau was set up. During this period it has done useful work in collecting information, tabulating experiments in extra-curricular activities and co-ordinating the work done in the various schools.

A programme of the excursions to be undertaken during each term should be drawn up in advance. The places selected should be such as would enrich the boys' experience and give them objective knowledge of things about which they read in their books. In a town the programme would include a visit to the Market, the Town Hall, Post Office, Water Works, local industrial centres, public gardens, Railway Station, Telegraph Office and Telephone Exchange, besides buildings of historic interest, if any. As many of these places would be within walking distance from the school, excursions would not usually mean any financial burden either to the school or to the pupils. The success of an excursion depends on the thoroughness with which the preliminary preparation is made and the way in which it is conducted by the teachers after the party has reached its destination. The pupils should be required to do a little reading beforehand. A few questions should be given to them and they should be told that they must seek the answers at the place visited. During the excursion the boys should be encouraged to ask questions. The teacher appointed to conduct the excursion should acquire a thorough knowledge of the place by visiting it beforehand. Each boy should be armed with a note-book and a pencil so that he may be able to note down what he observes. After each excursion there should be a discussion on it followed by the writing of an esssay.

School journeys are quite common in Europe. The German schools have established the class exchange system, whereby a whole class under the charge of a teacher goes to a school in another place for about a fortnight and a whole class from the latter school is received in exchange. The members of the visiting class attend lessons in the school where they are guests, but they spend most of their time in excursions and sight-seeing. Mention may also be made of a Bureau which has been established in Berlin in recent years with the object of promoting friendship between the German

the team spirit, inculcates fairness to colleagues and develops desirable attitudes towards opponents, judges and the audience. It is also a powerful incentive to extra reading. A debate should be so organised that every pupil gets on opportunity of taking part in it. It is better to have class debating societies than to have one debating society for the whole school. The subject should be announced beforehand with a list of books which might be consulted and all the pupils should be asked to come prepared The topics should be chosen with due regard to the interests of the pupils; they should never be abstruse or abstract, but, as far as possible, should be closely related to the life and experience of the pupils. Debates in the mother tongue might be arranged in the middle school section and both in the mother tongue and English in the High school stage. In a Mission school which I inspected a short time ago, a weekly Topical Class has been started as an adjunct to the school debating society. This class has been found very useful in interesting the boys in current topics and giving them information about them Last term the teachers discussed with the boys the following subjects, among others:—Fascism, Communism and Democracy; Civil War in Spain; Research in Malaria and Leprosy; George V; Patriotism; History of a letter (Post Service etc.); Locomotives and Motors; Italy and Abyssinia; Money and Barter; London, The Great War and after; Should India import foreign goods ?

School Excursions —School excursions give the children new experiences, add to their knowledge of the environment, develop their power of observation, bring the teachers into closer touch with their pupils and, above all, help to harmonise school instruction with real life In the big towns of England it is a common sight to see crowds of pupils marching through the streets with their teachers to museums, botanical gardens, zoological gardens, factories and buildings of historic interest, while in Germany so great is the importance attached to school excursions that they have been made compulsory once a month.

individual boys, tries to remove the bad and promote the needed qualities in them and gives them a healthy environment and healthy activities for mind and body. The programme of Scouting is so devised as to teach the scout to subordinate his selfish interests to the common good and to awaken in him the desire and the ambition to be of service to others. Scouting also encourages hobbies among the boys and thus teaches them how to use their leisure hours usefully and happily. But in India perhaps the greatest value of scouting is that it paves the way effectively for communal harmony, which our country sadly lacks The uniform, the Scout ideals founded on the Scout oath and the Scout Law, the patrol system, hiking, camping and other scout activities—all these help to unite the boys into one common brotherhood and to make them forget differences of religion, caste or creed

The objections sometimes raised against Scouting would, I think, disappear if its programme were adjusted more closely to our national needs, as has been done in some parts of India. No Scout troop can thrive unless it has the full support of the Head-Master of the school concerned. It is necessary to exercise the greatest possible care in the selection of the Scout Master, on whose personality, character and enthusiasm the success of the scout troop largely depends.

The chief obstacle in the way of the spread of Scouting in India is the poverty of the vast majority of the pupils. Thousands of boys anxious to become scouts cannot realise their ambition because they cannot afford to provide themselves with the uniform. No effort should therefore be spared to make the aims and objects of Scouting widely known to the public, so that it may come forward to help what is really a national cause.

Debating Societies.—Apart from its value in developing self-expression and the power of speech, debating offers opportunities for character training inasmuch as it cultivates

instruction that we should try to cultivate in the boys self-control, self-discipline and a sense of justice and fair play. It is therefore not sufficient to make provision for games; it is necessary to ensure that the boys play them in the right spirit. The revelation of the causes of the failure of the Indian cricket team which toured in England this year has brought home to us the vital need for developing the team-spirit in our students. Every teacher who is young enough to play should take part in games with the boys, for the play-ground offers to him a better opportunity of moulding their character than the class-room. Apart from this, participation in games is to his own advantage. There was a saying among the ancient Greeks: "A man will remain young just so long as he plays". You will feel all the more young if those with whom you play are school boys.

There is a tendency in some schools to concentrate on the members of the school team and to neglect the physical education of the rest of the school. In addition to the provision usually made for drill, arrangements should be made for all the boys to play some game or other at least twice a week. Adequate playing fields should be provided to secure this end In big towns, if it is not possible for each school to have a play-ground of its own, an attempt might be made to provide play-grounds common to schools of selected areas. It is not enough to have inter-school tournaments; every school should organise inter-class tournaments to give as many boys as possible a chance to play in matches.

Boy Scouting.—The great value of Scouting lies in the opportunities which it offers for character formation and training in citizenship. From the point of view of an educationist, the most striking feature of Scouting is that it embraces all the up-to-date principles of education—all-round development of the child through self-education, self-expression, self-activity and self-discipline. " Learn by doing " is the main principle followed. In the class room the teacher has to deal with a group, but the Scout Master studies

there is a teacher to sponsor and guide it. Every teacher should be expected to help in such extra-curricular activities as games, school excursions and school debating societies. In making new appointments on the staff of a school, it is not enough to know what the academic qualifications of the various candidates are. We should also inquire what kinds of extra-curricular activities they can handle. No application should be entertained unless it is accompanied by the testimonial of the head of the school or college where the candidate has received his education. There is no doubt that for the above-mentioned purpose such testimonials are generally of little help to the Inspector or whoever has the authority of making appointments, but it is sometimes useful to look in the testimonial for what it leaves out.

Another condition necessary for the success of out-of-school activities is the co-operation of parents. Every effort should be made to enlist the sympathy and interest of the parents in the extra-curricular programme, because, in the first place, this programme encroaches on the free time of the pupil, and, secondly, because the parents are frequently called upon to contribute towards the expenses entailed by it.

I will now deal with some of the more important extra-curricular activities which are in vogue in Indian Schools.

Outdoor Games.—Attempts made in recent years to popularise Indian games in our schools have not met with much success except in Primary Schools, where such games have been found useful owing to their cheapness. The fact that football, hockey and cricket have taken a firm root in the Indian soil should not hurt our national pride, as these games, at any rate football and hockey, are played all over the world. American games are also gradually finding their way into Indian schools. The chief advantage of American games is that they require comparatively small space.

Games have a beneficial effect not only on the physical and mental development of the child, but also on his moral development. It is through games rather than through direct

There is much talk to-day of educational reorganisation. The need for a reform of our educational system cannot be denied, but the problem of character building and training in citizenship cannot be solved by educational reconstruction. Its solution is to be found chiefly in the development of extra-curricular activities in our schools. In the class-room it is difficult for the teacher to establish personal touch with individual pupils. On the other hand, corporate activities outside the actual lessons provide opportunities for him to mix freely with his pupils and to gain their confidence in a way which is not possible in ordinary school work. The value of such activities is especially great in a country like India where residential schools are an exception rather than the rule and where the home influences, in the majority of cases, are not of the right kind.

The range of extra-curricular activities is very wide. They include games, athletics, debating and literary societies, school magazines, book clubs and reading circles, music and dramatic societies, school excursions and journeys, co-operative societies, gardening and scouting. It is not possible for any school to organise all these activities, nor is it desirable to attempt an extensive and ambitious extra-curricular programme. Activities like games, scouting, debating societies and excursions should be undertaken by every secondary school. Apart from these, the extra-curricular activities adopted should depend on the local conditions, the type of children in the school and their common interests. It is better to run a few out-of-school activities successfully than to practise a large number in a haphazard manner. Extra-curricular activities should never be forced, but they should arise from the needs and interests of the boys and the opportunities which the school offers.

If extra-curricular activities are to give training in leadership and responsibility, it is necessary that, as far as possible, the boys themselves should be allowed to manage them. But no extra-curricular activity can be started unless

contribute to its well-being. For the realisation of this aim, curricular work alone, however complete and up-to-date, is not enough. Hence the importance which is attached now-a-days to extra-curricular activities. It is interesting to observe that many activities, such as games, gardening and school excursions, which were formerly considered extra-curricular, are now treated as curricular in progressive schools

The advantages of extra-curricular activities, briefly speaking, are as follows:—

1. Besides supplying the social ideals necessary for training in citizenship, they provide situations wherein such ideals can be practised and the right kind of habits formed.

2. They develop leadership in the child by training him in the duties and responsibilities which will devolve on him later on as a member of society.

3. They bring the teacher into closer contact with his pupils and enable him to discover and develop their special aptitudes.

4. They bring school work into closer harmony with real life.

5. They are a means of cultivating hobbies in the pupil and of teaching him the right use of leisure.

6. They enhance the interest of the pupil in his school and strengthen his loyalty to it.

On the social and moral side, there is still much work to be done in Indian schools. It must be admitted that in the past our efforts have deen directed mainly towards preparing students for admission into the university. We have neglected the character-forming parts of education. Few schools in India can claim to have developed the right kind of *discipline, a discipline that comes from within*; fewer still to have cultivated the civic sense in the pupils.

truthful, conscientious. I have held up examples of women, men, girls and boys, and praised these examples. That was all In effect, but not in moralizing words, it was an ethical hint, or unspoken suggestion :—"This is the way good people have behaved, and will you not like to march in the same noble path?" Of course, the examples have been drawn from all nations and races without preference of any one source, and, in many instances, I have taken illustrations from the life of primitive and so-called "uncivilized" tribes. Needless to say, such moral instruction necessarily implies equality of respect toward all the Faiths and all schools of thought.

The preceding notes suppose that a teacher gives systematic lessons on moral themes Since I and my fellow-workers in the movement framed such schemes in the period 1897—1914, my own educational philosophy has widened into a universal vision which includes moral instruction as a factor, or aspect, of the history of humanity. Of this history I may venture to write later in the hope of interesting readers in India

---

Some Practical Suggestions for Extra-curricular Activities in Secondary Schools.[1]

BY

S. Ali Akbar, M. A., (Cantab).

There was a time, and in India it was not long ago, when schools existed simply to prepare students for examinations or at best to give them knowledge. Happily, it is now being increasingly realised that what the school has to aim at is not merely intellectual training, but developing the personality, character and individual capacities of the child and training him in citizenship, so that when he grows up he may take his rightful place in society and

1. An address delivered at the 12th All-India Educational Conference held at Gwalior in December, 1936.

Moral Instruction without Moralizing

BY

Frederick J. Gould (London).

A crowd of professors and teachers from many nations sat as silent listeners behind a class of children to whom I told short stories on "Family, Country, Humanity" at the first International Congress of Moral Education (London, 1908). Among the listeners was Mr. W. H. Sharp, Director of Public Instruction, Bombay (He died in 1917). At Mr. Sharp's suggestion I visited the Bombay Presidency (January — February 1913), and gave similar lessons to classes of Secondary School youths in Bombay, Dharwar, Belgaum, Poona, Karachi, Hyderabad (Sindh), Ahmedabad, Surat, and, by invitation of H. H. the Gackwar, at Baroda. My talk in London comprised anecdotes of Eskimo women, a Hungarian mother, King Alfred of England, the Italian patriot Manin, and the English Dr. Hall Edwards, who experimented with X-rays, and, in the service of humanity, injured his own health very seriously. The reader will now understand Mr. Sharp's remark to me when I observed that I never gave Moral Instruction apart from illustrative anecdotes Mr. Sharp said: "If you had merely talked of morals without the stories, we would never have invited you to Bombay". On the same principle I have stood,—black-board on my left, and a score of girls and boys in front, many hundreds of times in Britain and the United States. My various note-books, printed or manuscript, contain a store of some 4000 little stories drawn from legend, history, biography, and newspapers. The general scheme of ethical topics, which I first outlined in 1897, embraces—self-control, self-respect, order, modesty, trustworthiness, honesty, honour, kindness, generosity, personal service, social service, work, justice, mercy, courage, prudence, persistence, animals, international peace and co-operation, humanity, ideals, and so on. Never have I exhorted children to be kind, helpful,

The Hyderabad Teacher

CONTENTS

VOL. XII No. 1

THE HYDERABAD TEACHER

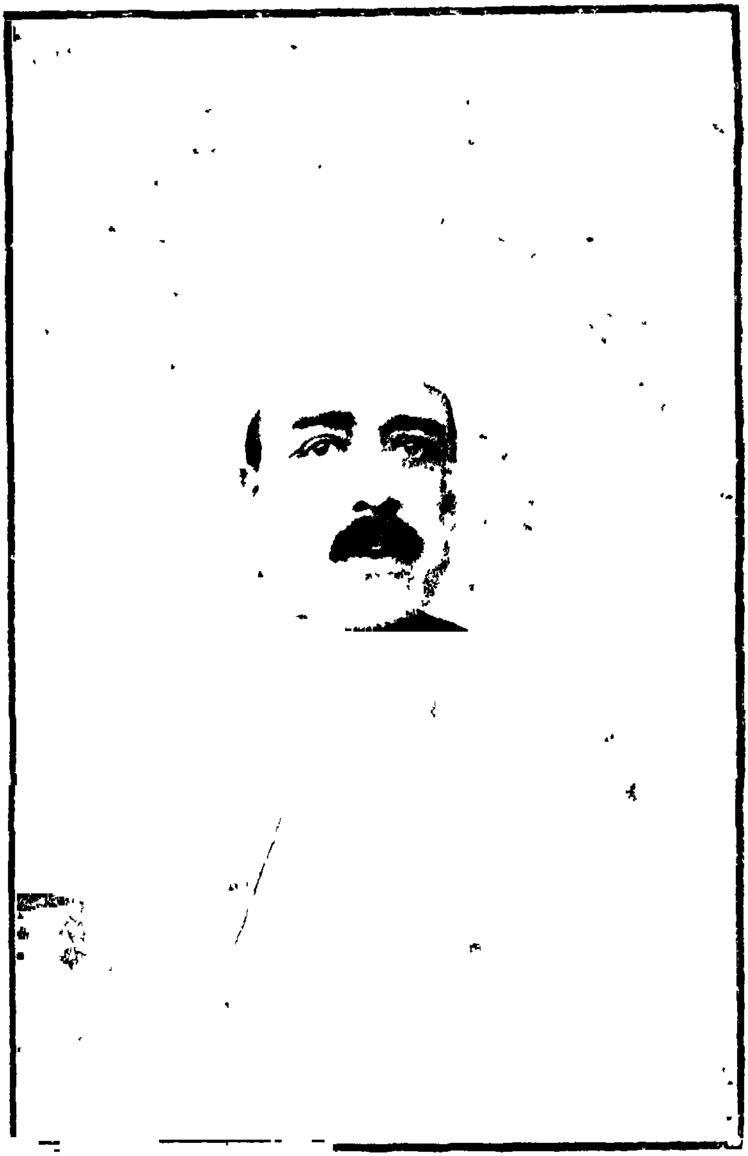
JULY—SEPTEMBER 1937.

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.
Under the Patronage of
SYED MOHAMED HUSAIN JAFERI Esq., B. A., (Oxon).
Director of Public Instruction.

Editorial Staff

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1937

Annual Subscription Rs. 3.



THE LATE SIR ROSS MASOOD
(NAWAB MASOOD JUNG BAHADUR)

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ آذر لغایتہ بہمن سنہ ۱۳۴۲ف

فہرست مضامین

جلد (۱۲) شمارہ (۲)

تاریخ ریاضیات

ابتدائے افرینش سے ۱۸۰۰ ق۔م۔ تک

از

سیّد عبدالحکیم یم۔ یس سی۔ ایل۔ ٹی

ماہرین تعلیم خصوصاً فروبل اور پسٹالوزی سائنٹیفک مضامین کی درس و تدریس کے لئے تاریخی طریقہ تعلیم کے حامی ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ چونکہ فرد کا دماغ نوع انسان کے دماغ کے مشابہ ہوتا ہے لہذا بچہ کی تعلیم اپنے اصول اور ترتیب میں تاریخی حیثیت سے نوع کی تعلیم کے مماثل ہونا چاہئے۔ یا بہ الفاظ دیگر ہر بچہ کی تعلیم کا وہی قدرتی راستہ ہونا چاہئے جس پر انسان اپنی تعلیم میں گامزن رہ چکا ہے۔ گو اس نظریہ کے موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس امر سے مطلق انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ریاضیات کے مثل علمی مضامین کی تعلیم کے لئے ان علوم کی تاریخی ارتقاء سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ تاریخ ریاضیات کے مطالعہ کے بعد ایک صاحب فکر استاد اپنے اسباق کو قبل سے زیادہ دلچسپ اور اصولاً زیادہ بہتر بنا سکتا ہے اس منشا کی تحت ذیل میں اس موضوع پر ایک مختصر سا مضمون دیا جاتا ہے۔

اپنی نوعیت کے اعتبار سے ریاضیات کی تاریخ چار خصوصی دور پر مشتمل ہے۔ ایک وہ طویل دور جو آغاز کائنات سے شروع ہو کر تقریباً پیدائش مسیح سے ۵۰ ہزار برس قبل ختم ہو جاتا ہے۔ اس زمانہ کو ہم زمانہ قبل از تاریخ کے نام سے موسوم کریں گے۔ دوسرا وہ دور ہے جبکہ تہذیب اور تمدن کی ہلکی ہلکی شعاعیں دنیا کے چند خوش نصیب ممالک پر پڑنا شروع ہوتی ہیں۔ یہ زمانہ پیدائش مسیح سے تقریباً ۵۰ ہزار برس قبل

شروع ہو کر ۱۰۰۰ ق۔م۔ پر ختم ہوتا ہے اس زمانہ کو ہم زمانہ قدیم کے نام سے موسوم کریں گے۔ ریاضیات کی تاریخ کا تیسرا دور ۱۰۰۰ ق۔م۔ سے شروع ہوتا ہے اور تقریباً ۱۵۰۰ء میں ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ اہل یونان، ہندوستان، چین اور اہل عرب کے کارناموں کا زمانہ ہے۔ ہم اس کو قرون وسطیٰ کے نام سے موسوم کریں گے۔ ریاضیات کا چوتھا دور موجودہ زمانہ ہے۔ جو اپنی عمر میں گذشتہ تین زمانوں سے بہت چھوٹا ہے۔ لیکن اپنی رفتار ترقی میں سب سے بازی لے گیا۔

زمانہ قبل از تاریخ ابتدائے آفرینش سے ۵۰ ہزار برس قبل مسیح۔

فی زمانہ جب ہم اپنے نظام شمسی کی پیدائش پر غور کرتے ہیں اور اپنے دوربین کے زاویہ کو کسی ایسے ہیولا یا دھیمی دھیمی روشنی سے چمکنے والے ستاروں کے جھرمٹ کی جانب پھیر دیتے ہیں جو عنقریب کسی کائنات میں مبدل ہونے والے ہیں تو ہم اس واقعہ سے نہایت متحیر ہوتے ہیں کہ یہ ستاروں کا ہجوم ایک بے پایاں مادی گیسوں کا مجموعہ ہے جو ایک خاص طریق بشکل پیچاں "◎" پر متحرک ہے۔ (یہ ایک ایسا طریق یا منحنی ہے جس کے تفصیلی خواص کی تحقیق انسانی ارتقاء کے بہت بعد عمل میں آئی) اس انکشاف کے علاوہ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ اجسام فلکیات مختلف ایسے طبعی قوانین کے تابع ہیں۔ جن کو عموماً ریاضی کی زبان میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی خاص قوتوں کے زیر عمل کسی بیضاوی راستہ پر گردش کرتے ہیں۔ کوئی (Parabola) کا خاکہ بناتے ہوئے کسی لامحدود فاصلے سے ہمارے نظام شمسی میں داخل ہوتے ہیں۔ اور پھر لاکھوں برس کے واسطے اس طریق کی دوسری ساق پر رواں ہو جاتے ہیں۔

زمین کا ستارہ بھی اسی طرح آج سے اربوں سال قبل کسی ہیولا کے گیسی مادہ سے پیدا ہوا ہوگا۔ اور آخر میں سورج کے گرد ایک بیضوی راستے پر محو گردش ہو گیا۔ جب آہستہ آہستہ عمل تبرید سے اس کی بیرونی سطح کی تپش کم ہونے لگی تو جن عناصر اور مرکبات سے یہ مرکب تھا وہ ریاضیات سے متعلقہ عجیب و غریب کرشمات کے

حامل بن گئے۔ اس طرح کاربن کے ذرات آپس میں ایک دوسرے سے ترکیب ملاکر ہیرے کے جگمگاتے منتظم ہشتمن شکل کے قلموں میں تبدیل ہو گئے۔ سلکا مخروطی سروں کے مسدسی منشوروں میں ظاہر ہو گئے۔ اور پانی کے بخارات النو یا نچ میں تبدیل ہو کر سفید روئی کے گالوں کی طرح گل نما قلموں کی صورت بن کر فضا میں اُڑنے لگے۔ انہیں مشاہدات سے متاثر ہو کر افلاطون کہتا ہے کہ "صانع قدرت روز ازل سے ایک مہندس ہے"۔

آثار حیات آہستہ آہستہ بے شمار تغیرات کے بعد جب زمین کی بیرونی سطح اس تپش پر آگئی کہ اس پر حیات کا آغاز اپنی ابتدائی شکل میں نمودار ہو جائے تو ہائیڈروجن اور آکسیجن کا وہ سادہ ترین مرکب جو فضا میں بشکل بخارات پھیلا ہوا تھا بادل کی گھنگھور گھٹاؤں میں تبدیل ہو گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلیں اور اس ویرانہ پر بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ سلسلہ صدہا سال قائم رہا۔ دریا و سمندر پانی سے بھر گئے۔ ان سمندروں کے ساحل پر حیات بصورت کائی جو ایک نرم جلاطینی مادہ پر مشتمل تھی پیدا ہوئی۔ اس جلاطینی مادہ سے ایک طرف سمندری گھانس اور پھر گھانس سے دیگر نباتات کا وجود ہوا۔ اور دوسری طرف گھونگے، سرطان اور بالآخر مچھلی پیدا ہوئی۔ کائنات پر حیات کا آغاز ہوتے ہی ریاضیات کا ایک نیا دور شروع ہوا اب تک صناع قدرت کی ریاضیات کا اظہار ریبلا کے طریق ہیجان میں یا معدنیات کے عمل قلماؤ میں تھا۔ اب وہی صفت حیوانات و نباتات کی اشکال میں ایک نئے انداز سے ظاہر ہوئی۔ پودوں کی جڑیں اور پتیاں ایک خاص نظام کے تحت جیومٹرک اور ہارمونک سلسلوں میں مرتب ہو کر ڈنٹھل اور شاخوں پر نمایاں ہو گئیں پتیاں اور پھل مختلف ہندسی اشکال میں نمودار ہوئے۔ مثال کے طور پر خربوزہ، اناس، ککڑی، سنگھاڑے کی کروی، بیضاوی، سہ پہلوی اور مثلثی ساخت پر غور کر لیجئے۔ ہم کو معلوم ہے کہ یہ پودے تقسیم غذا میں بھی قانون معاشیات پر پورا عمل کرتے ہیں۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اس قانون اور قرنی پودے کے بہت سی حصہ میں جو تعلق ہے وہ ریاضی کے ضابطہ $\frac{1}{2}(\sqrt{5}-1)$ سے ظاہر ہوتا ہے

نباتات کے بعد جب حیوانات کی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے تو ایسے ذی شعور تصورات کی بنیادیں پڑتی ہیں جو شکل تعداد اور فاصلہ کی کمی و بیشی سے متعلق ہیں۔ مثلاً ایک شکاری کتا جانتا ہے کہ اس کے اور شکار کے درمیان چھوٹے سے چھوٹا راستہ خط مستقیم ہے یا وہ جب اپنے شکار کے تعاقب میں ہوتا ہے تو اپنی اور شکار کی رفتار کے باہمی تعلق کو خوب سمجھتا ہے۔ چمپا نزی کو یہ معلوم ہے کہ پانچ اشیاء کی تعداد چار سے زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مثلاً چیونٹی اور دیمک اپنے اپنے گروہوں کی مقابلتاً تعداد سے واقف ہیں۔ ان مشاہدات سے ہمارا یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ ماقبل تاریخ کے حیوانات جن کے اکازی (فیات کے ڈھانچوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بعض بعض ایسے دیوہیکل تھے جو اپنے طول اور قامت میں سو سو فٹ تک پہنچتے تھے اس قسم کے ابتدائی ریاضیات سے ناواقف ہوں۔ یہ تصورات صرف اعداد و شمار کے ایک غیر واضح مفہوم پر ختم نہ ہوتے تھے بلکہ علم ہندسہ میں بھی ان کو ایسا ہی دخل تھا۔ مکڑی جب اپنا جال بناتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقیم الاضلاع اور باقرینہ اشکال کے جملہ خصوصیات سے واقف ہے۔ شہد کی مکھیاں اپنا چھتا تعمیر کرنے میں چھوٹے بڑے مسدسی خانے اس خوبی سے بناتی ہیں کہ گویا وہ کلیات اعظم و اقل پر کامل دسترس رکھتی ہیں۔ اور اس سے زیادہ حیرت اس مشاہدہ سے ہوتی ہے کہ ان کی ملکہ بڑے خانوں میں بڑے انڈے چھوڑتی اور چھوٹی خانوں میں چھوٹے گویا کہ وہ انڈے کی جسامت اور جگہ کی موزونیت کو سمجھ سمجھ کر اپنے فعل کو انجام دیتی ہے۔ دیمک کی منظم زندگی اور ان کے شہر کی تعمیر سے پتہ چلتا ہے کہ گویا وہ زاویوں کی پیمائش اور مساحت کا علم رکھتی ہیں۔ پرندے بھی اپنا گھونسلا بناتے ہیں ہندسی عمل کا بیّن ثبوت دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ علم حیوانوں اور پرندوں نے کس استاد سے سیکھا ہو ان رنگوں میں خاص خاص ہندسی اشکال کی گوناگوں آمیزش کس مصور نے کی ہو ناظرین خود اس کا فیصلہ فرمالیں۔ استاد کو چاہیئے کہ ریاضیات کی تعلیم میں طلباء کے خیالات کو اس جانب موقع اور محل کے

ملاحظہ سے وقتاً فوقتاً منعطف کرتے رہیں تاکہ مضمون میں دلچسپی کے ساتھ ہی ساتھ صانع قدرت کی شان اور احترام ان کے دلوں میں پیدا ہو۔

نسل انسانی کا آغاز

انسانی نسل کا آغاز ہوتے ہی جس کو کم از کم دس لاکھ برس کے زمانہ گزرے ہیں رو ئداد تاریخ ریاضیات کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔ اب تک پرندوں اور حیوانوں میں اعداد و علم ہندسہ کا جو اظہار ہوتا تھا وہ ایک بڑی حد تک ان کے عادات اور جبلتوں سے متعلق تھا۔ جس طرح کپڑے کی ایک مشین سے معینہ طول کا کوئی کپڑا جس پر ہندسی اشکال کے گل و بوٹے بنے ہوں نکلتا رہتا ہے لیکن مشین اپنے کارناموں سے ناواقف ہے تقریباً بالکل اسی طرح حیوانات بھی اپنے کارناموں کو باقاعدہ مشین کے پرزوں کی طرح انجام دیکر خود اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ ایک مچھلی آبدوز کشتی کی طرح کبھی پانی کے اندر اور کبھی باہر آتی ہے لیکن وہ نہ ارشمیدس کو جانتی ہے اور نہ اس کے اصول کو یہی حال مکڑی، چیونٹی اور دوسرے حشرات کا ہے۔ لیکن انسان جو کچھ کام کرتا ہے۔ وہ اس کے لئے بامعنی ہوتا ہے گو ابتدا میں اس کا معیار کچھ برائے نام ہی حیوانات سے بڑھا ہوا تھا۔

ابتدائی اعداد و شمار

ابتدائی انسان کی ضروریات نہایت مختصر تھے۔ وہ درختوں کے پھل و پھول یا کسی جانور کا شکار کرکے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ اُس کا خاندان صرف چند افراد پر مشتمل تھا یا اُس کو دو چار دشمنوں سے سابقہ تھا۔ ان معمولی ضروریات کے تحت اس کے اعداد و شمار کا ذخیرہ ایک اور دو اعداد سے زیادہ نہ تھا۔ شکار کے بعد جب اس نے گلہ بانی کا پیشہ اختیار کیا تب بھی اُس کے اعداد میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا۔ اس وقت وہ گو اپنے جملہ چوپاؤں کو شمار کرنے کی اہمیت نہ رکھتا تھا مگر ان کی شکلوں سے یہ بتا سکتا تھا کہ فلاں فلاں چوپایہ اُس میں سے کم ہے۔ البتہ اس منزل پر آنے کے بعد اُس کی زبان میں اس قسم کے الفاظ بن گئے تھے جو بہت، زیادہ، کثیر، ڈھیر اور ہجوم کے ہم معنی تھے۔

یہ قیاسیات مختلف وحشی اقوام کی زندگی کے مطالعہ سے بہ آسانی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ صدی میں کم از کم تیس مختلف اسٹریلیا کے اصلی باشندوں کی زندگی کا مطالعہ کیا گیا۔ ان اقوام کی اکثر زبانوں میں ایک اور دو کے علاوہ دوسرے اعداد کے لئے کوئی الفاظ نہ تھے۔ ان میں صرف چند زبانیں ایسی تھیں جن میں دو کے بعد چار تک کے اعداد کے لئے الفاظ موجود تھے۔ چار سے بڑے اعداد کے لئے "بہت" یا متعدد کے مترادف الفاظ تھے اعداد و شمار کی یہ کم مائیگی صرف اسٹریلیا کے باشندوں میں ہی نہ تھی بلکہ عموماً ہر ایسے قبائل کی یہی حالت تھی جو اپنے ملک کی جغرافیائی حالت کے لحاظ سے دوسرے مہذب ممالک سے بیگانہ رہے چنانچہ انڈمان کے اصلی باشندوں کی زبان میں بھی دو سے بڑے عدد کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے وہ اپنے مخصوص طریقہ پر دس تک شمار کر لیتے ہیں وہ اپنے ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی سے ناک چھو کر کہتے ہیں ایک (اُباتول)، پھر دوسری انگلی سے ناک چھو کر کہتے ہیں دو (ایک پور)، پھر یکے بعد دیگرے ناک چھو کر کہتے ہیں "اور یہ۔ اور یہ (اُنکا) اور جب دونوں ہاتھوں کی دسوں انگلیاں ختم ہو جاتی ہیں تو دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہتے ہیں "اُر و رو" یا تمام شد۔

مجرد اعداد کا شمار ابتدا میں انسان مجرد اعداد کے شمار سے بالکل قاصر تھا۔ وہ ہمیشہ اعداد کو کسی اشیاء سے مربوط کر کے کہتا تھا۔ مثلاً کسی شے کے طول کی پیمائش میں وہ بوقت پیمائش ایک ہاتھ، دو ہاتھ، تین ہاتھ کہتا جاتا تھا۔ ایک۔ دو۔ تین مجرد اعداد کو ہاتھ کی اکائی سے علیحدہ کر کے نہ سمجھتا تھا۔ انگریزی نظام میں طول کی پیمائش کی اکائیوں کی بنیادیں اکائی سے مجرد اعداد علیحدہ کرکے اسی اصول کے تحت پڑیں۔ مثلاً فٹ (قدم)، انچ (انگوٹھا)، فرلانگ (Furrow-long) کی اکائیاں اس واقعہ پر روشنی ڈالتی ہیں کہ کبھی یہ الفاظ اعداد کے ساتھ وابستہ تھے۔ بعد میں ہزارہا سال گذر جانے کے بعد جب انسان مجرد اعداد کا مفہوم سمجھنے لگا تو یہ الفاظ طول کی اکائیوں کے معنی میں مستعمل ہو گئے۔

ابتدا میں انسان کو بھی ہندسہ مثلاً ۲ ان اکائیوں سے علیٰحدہ کر کے نہ سمجھتا تھا ملایا اور میکسیکو کے باشندوں میں اعداد کے ناموں کے لغوی معنی ایک پتھر، دو پتھر اور تین پتھر ہوتے ہیں۔ اسی طرح بحر الکاہل کے جنوبی جزائر کے باشندوں میں اعداد کے نام ایک ثمر، دو ثمر اور تین ثمر ہیں۔ اور اہل جاوا اپنے اعداد کو ایک دانہ۔ دو دانے۔ اور تین دانوں کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی طرح جب افریقہ کا ایک زولو چھ کا عدد کہنا چاہتا ہے تو اپنے ہاتھ کا انگوٹھا پکڑ کر کہتا ہے "ٹے۔ بِس۔ ٹوپا" (انگوٹھا پکڑا)۔ اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہاتھ کی تمام انگلیاں شمار کر چکا ہے اور اب چھ کے عدد پر پہنچا ہے۔ سات کا عدد شمار کرنے میں وہ انگوٹھے کے بعد کی انگلی پکڑتا ہے اور کہتا ہے "یو کمبائیل" یعنی وہ انگوٹھے کی بعد والی انگلی پر پہنچا۔ اسی بنا پر ہم یہ اصول اخذ کرتے ہیں کہ ابتدا میں بچوں کو مقرون اشیا کی تحت تعلیم دینا چاہئے۔ اُن کا دماغ نوع کے دماغ کی طرح مجرّد تعلیم کے لئے موزونیت نہیں رکھتا ہے۔

تعین معیار ترقی عدد سلسلہ اعداد میں انسان کو جو پہلا عدد ملا وہ ایک تھا۔ آگے بڑھ کر جب اُس نے ایک سے زائد اعداد کی ضرورت محسوس کی تو اِس کے سوا اور کچھ نہ کر سکا کہ وہ اسی بڑے عدد کو چند اکائیوں کا مجموعہ سمجھے۔ مثال کے طور پر اہل بابل اور قدیم مصر کے باشندوں کے ہندسی کتابت پر غور کیجئے۔ (اہل بابل پانچ یوں لکھتے تھے ۷۷۷۷۷۔ اہل مصر ۱۱۱۱۱)۔ ایک کے بعد انسان کا دوسرا عدد ۲ تھا۔ ابتدا میں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی جملہ گنتیاں دو سے زیادہ نہ تھیں لہذا اس کا معیار ترقی عدد بھی دو سے آگے نہ بڑھا۔ چنانچہ اہل شام کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں اُن کا معیار عدد دو تھا۔ وہ اپنے اعداد کو یوں لکھتے تھے۔ ۱ ۲ ۱۲ (۳) ۲۲ (۴)۔ کوئینس لینڈ کے باشندوں کا شمار کرنے کا طریقہ بھی ایسا ہی ہے۔ ایک۔ دو دو اور ایک دو اور دو وغیرہ۔ افریقہ کے کوتاہ قد قبیلے اسی طرح شمار کرتے ہیں۔

دو کے مقابلہ میں تین اور چار معیار عدد زیادہ رہا ہے۔ چنانچہ لاطینی، یونانی، انگریزی اور فرانسیسی زبان میں اب بھی تحریر نظم میں بعض اوقات تین بہت کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ قدیم فونیقی زبان میں بھی ۳ کا معیار عدد ہونے کا پتہ چلتا ہے مثلاً اُن کا طریق شمار یوں چلتا تھا۔ ایک، دو، تین، تین اور ایک، تین اور دو، وغیرہ۔ جنوبی امریکہ کے بعض قبائل میں اب بھی معیار عدد چار ہے۔

پہلا معیار جو قدیم زمانہ میں وسیع پیمانہ پر مستعمل تھا وہ پانچ تھا۔ دو، تین اور چار کو معیار صرف چند خاص خاص قبائل نے اختیار کیا۔ لیکن جب انسانی ضروریات وسیع ہوئیں اور اس کو بڑے اعداد کو شمار کرنے کی ضرورت پڑی تو اُس نے اپنے ہاتھ کی پانچ انگلیوں سے کام لیا۔ اس نظام میں ۵، ۲۵، ۱۲۵، ۶۲۵ ایک دوسرے کے ضعف ہیں۔ یہ طریقہ شمالی امریکہ کے ریڈ انڈین میں مروج ہے۔ سائیبریا کے اسکیمو میں بھی یہی طریقہ جاری ہے۔ وسط اور جنوبی امریکہ کے قدیم باشندوں میں اس کا عام استعمال ہے۔ وہاں کے چند قبائل اپنے ہاتھ کی عدد سے یوں شمار کرتے ہیں ایک دو تین چار پنجہ (ہاتھ) پنجہ اور ایک (چھ) پنجہ اور دو (سات) وغیرہ۔

معیار دس

تعین معیار عدد کی نسبت اقوام میں مختلف طریقے جاری رہے لیکن عام طور پر جو عدد معیار ترقی عدد کے لئے منتخب ہوا وہ دس تھا۔ اس انتخاب کے لئے انسان ایک بڑی حد تک اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی تعداد کا مرہون منت ہے۔ تقریباً ۷۰ سے زیادہ افریقہ کے قبائل میں معیار عدد دس ہے جب انسان نے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیوں کے معیار پر کامل دستگاہ حاصل کر لی اور اس کو قبل سے زیادہ بڑے اعداد کو شمار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ طبعی طور پر پانچ سے دس پر جو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کا مجموعہ تھا راست چلا گیا۔ درمیانی اعداد کا معیار شاذ و نادر ملتا ہے۔ رومن میں پانچ کا ہندسہ یوں لکھتے ہیں V۔ اس علامت کے متعلق خیال ہے کہ یہ ہاتھ کے کھلے ہوئے پنجے کو

ظاہر کر رہا ہے۔ جس میں طرفین کی دو انگلیاں انگوٹھا اور چھوٹی انگلی کے علاوہ درمیانی تین انگلیاں حذف کر دی گئیں ہیں۔ پانچ کے بعد اس علامت کے موجد دس پر کیسے پہنچے۔ دس کی ساخت سے صاف پتہ چلتا ہے X یہ علامت دونوں ہاتھوں کو اُلٹ کر متحد کر دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ کچھ تو میں ایسی بھی تھیں جنہوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے مجموعہ پر اکتفانہ کی اور دونوں ہاتھ اور دونوں پیروں کی انگلیوں کے مجموعہ کو معیار قرار دیا۔ پانچ کے معیار کے بعد ایزٹیکس کے قبائل بیس پر کیسے آئے۔ ذیل کی مثال سے واضح ہوگا۔

۱+۵+۱۰ ۵+۱۰ [] ۱۰ ...... ۲+۵ ۱+۵ [] ۵ ۴ ۳ ۲ ۱

معیار دس و پانچ مخلوط — معیار پانچ

[] ۲۰ ... | ۲+۵+۱۰

۱۰+۲۰ .... ۱+۲۰

معیار بیس

فرانسیسی زبان میں اب بھی ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے میں اِن کے بزرگ بیس کا معیار رکھتے تھے۔ مثلاً ۸۰ کے لئے اس زبان میں جو لفظ ہے اُس کا مفہوم چار بیس ہے اور نوّے کے لئے چار بیس + دس ہے۔ افریقہ کے دیری نامی قبائل میں بھی بیس معیار عدد ہے وہ اپنے اعداد یوں لکھتے ہیں:-

...۱+۲۰ || ۲۰ ...... ۱+۵+۱۰ || ۱۰ .... ۲+۵ ۱+۵ ۵

۲۰+۱۰ || اور پھر ۴۰ = ۲۰ + ۲۰ ۵۰ = ۲۰ + ۲۰ + ۱۰ اور اسی طرح ۷۰ =

۲۰+۲۰+۲۰+۱۰ اور ۹۹ = ۲۰+۲۰+۲۰+۲۰+۱۰+۵+۴ ۔

ہندوستانی زبان میں بھی بعض چیزوں کا شمار بیس یا کوڑیوں میں ہوتا ہے اور غالباً زمین کی پیمائش میں ۲۰ بسوانی ایک بسوہ اور ۲۰ بسوہ ایک بیگھ کا پیمانہ معیار بیس کی قدیم یادگار ہے۔

۱۲ کے معیار اگر انسان اتنا خوش قسمت ہوتا کہ اُس کے ہاتھوں میں پانچ پانچ انگلیوں کی بجائے چھ چھ انگلیاں ہوتیں تو یقیناً آج دنیا کا معیار

ترقی مدد دس کی بجائے بارہ ہوتا۔ اور یہ معیار دس کے مقابلہ میں حسابی معاملات میں زیادہ سہولت بخش ہوتا۔ کیونکہ بارہ ایک ایسا عدد ہے جو دوؔ تینؔ چارؔ اور چھؔ پر پورا پورا تقسیم ہو جاتا ہے۔ لیکن دس صرف دوؔ اور ۵ پر تقسیم ہوتا ہے۔ اس طرح ہم متعدد روزمرہ میں استعمال ہونے والی کسور کو زیادہ آسانی کے سادے ہندسوں میں ظاہر کر سکتے اور تقسیم کا عمل مقابلتاً زیادہ آسان ہو جاتا۔ اضافہ صرف اس قدر ہوتا کہ دس اور گیارہ کے لئے دو علامتیں اور بنانا پڑتیں۔ فرض کرو دس کی علامت ع یہ ہوتی اور گیارہ کی M یہ ہوتی۔ تب ہم بارہ دس کی طرح لکھتے، چوبیس بیس کی طرح اور ۳۶ تیس کی طرح۔ لیکن تب ۲۲ = ۱ع اور ۲۳ = ۱M یوں لکھا جاتا۔ اسی طرح ۳۴ = ۲ع اور ۳۵ = ۲M یوں لکھا جاتا۔ ہم کو اپنے پہاڑوں کا سلسلہ بھی دس کی بجائے بارہ پر ختم کرنا پڑتا۔ اِس امر کو تسلیم کرنے کے لئے کافی ثبوت موجود ہیں کہ زمانہ قدیم میں مختلف قومیں بارہ کو معیار عدد قرار دے چکیں ہیں۔ اور پیمائشی ضروریات میں یہ خاص طور پر مستعمل تھا۔ چنانچہ ۱۲ انچ کا فٹ، ۱۲ آؤنس کا قدیم پاونڈ، ۱۲ پائی کا آنہ، ۱۲ اسیر کا من، ۱۲ اشیاء کا درجن اس کی مقبولیت پر دلالت کرتے ہیں۔ ملک سوئیڈن کے ایک فرمانروا نے یہ کوشش بھی کی کہ دس کے بجائے ۱۲ معیار ہو۔ مگر عام رواج کو حکم شاہی بھی نہیں تبدیل کر سکتا ہے۔

زمانہ قدیم ۵۰۰۰۰ تا ۱۰۰۰ ق م
۵۰ ہزار تا ایک ہزار

زمانہ قبل از تاریخ کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ بالکلیہ ہمارے تخیلات اور قیاسیات کا نتیجہ ہے۔ ہمارے پاس اس زمانہ کے نہ تو کوئی ماخذ ہیں اور نہ کوئی شواہد ہیں ہماری قیاس آرائیاں موجودہ یا گزشتہ صدی کے ان وحشی اقوام کی زندگی کے مطالعہ پر مبنی ہیں۔ جن کو مہذب اور متمدن ممالک کے باشندوں سے ملنے جلنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ اور جو اپنے معیار علم میں زمانہ قبل از تاریخ کے انسان سے بہتر نہ ہوں۔ رہا ریاضیات کے وہ حقائق جن کا وجود نباتات اور جمادات کی ساخت یا زمین کے طریق گردش میں تھا۔

ان کے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ جس طرح آج چار کا مربع سولہ کے مساوی ہے اور وہ ماضی و مستقبل میں بھی سولہ تھا اور سولہ رہے گا اسی طرح قانون قدرت کے یہ سرچی اصول بھی ہمیشہ سے یوں ہی کار فرما تھے اور کار فرما رہیں گے زمانہ قبل از تاریخ سے گزر کر جب ہم انسانی ارتقا کی تاریخی منزل میں داخل ہوتے ہیں تو ہم بالکلیہ اپنے بیانات کی بنیادیں قیاسیات پر نہیں رکھتے ہیں اب ہمارے بیانات کے ثبوت میں آثار قدیمہ کی وہ یادگاریں ہیں جو انسان نے کتبوں، نقوش نوشتوں اور دیگر صورتوں میں ہمارے لئے چھوڑی ہیں۔ ان باقیات کے لحاظ سے تاریخ ریاضیات کا یہ قدیم دور تین نمایاں زمانوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک وہ دور ہے جو پتھر کا ابتدائی زمانہ کہلاتا ہے۔ اس کا آغاز زمین پر تیسرے برفانی زمانہ کے گزر جانے کے بعد مسیح کی پیدائش سے تقریباً ۵ ہزار برس پیشتر شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ کے باقیات میں پتھر کا اس قسم کا سامان ملتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں انسان میں تجارتی لین دین شروع ہو گیا تھا۔ اور اس کے واسطے علم اعداد و شمار کی ضرورت پڑنے لگی تھی۔ اور ان میں غیر مجرد اعداد کا مفہوم پیدا ہو گیا تھا۔ ریاضیات کا دوسرا دور پیدائش مسیح سے تقریباً ۱۵ ہزار برس قبل پتھر کے درمیانی زمانہ میں شروع ہوتا ہے۔ اس وقت کائنات کا چوتھا برفیلا دور گزر چکا تھا۔ اس زمانے کے فنون کے جو قدیم ترین نمونے ملے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس وقت تک مجرد اعداد کے مفہوم سے واقف ہو چکا تھا۔ پتھر کا آخری زمانہ قبل کے دو زمانوں سے مقابلتاً بہت چھوٹا ہے۔ یہ تقریباً ۶۰۰۰ ق۔م۔ سے شروع ہوتا ہے اس وقت تک اعداد و شمار کا باقاعدہ نظام مرتب ہو چکا تھا۔ اور ستاروں کے مشاہدات علم نجوم کی صورت میں تشکیل پا چکے تھے۔ یہ ریاضیات کے قدیم دور کا آخری زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں تقریباً ۴۰۰۰ء ق۔م۔ میں جزیرہ نمائے سینائی میں دھات کا انکشاف ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد تقریباً ۳۵۰۰ء ق۔م۔ میں تحریر کا وجود ہوا۔ اور تقریباً اس کے ۵۰۰ برس بعد مصر میں

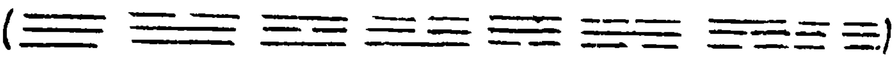
اولیں پتھر کی عمارت تعمیر ہوئی۔ اور اس سے ایک صدی بعد سنہ ۲۹ ق۔م۔ میں اہرام مصر جو دنیا کے ہفت عجائبات میں سے ہے مصر میں تعمیر ہوئے۔ ان واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب ریاضیات اعداد و شمار سے تجاوز کر کے عملی ہندسہ، مساحت اور نجوم کے ابتدائی مدارج پر پہنچ چکی تھی۔ لیکن علم ریاضیات کی یہ اولیں صبح صرف دنیا کے چار خوش نصیب ممالک میں نمودار ہوئی تھی۔ دنیا کے باقی حصوں میں اب بھی وہی زمانہ قبل از تاریخ کی سیاہی چھا رہی تھی۔ یہ خوش قسمت ممالک چین، ہندوستان عراق (بابل) اور مصر تھے۔ ان میں سے ہر ملک کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اپنی ریاضیات اور دوسرے علوم کی تحقیق، تنظیم میں دوسروں پر شرف اولیت رکھتا ہے۔ اس امر کا قطعی فیصلہ کرنا کہ شرف اولیت کس کو حاصل ہے ایک حد تک ناممکن ہے لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ چاروں ممالک قدیم ترین تہذیب اور تمدن کے حامل تھے اور ان کا دعویٰ ایک بڑی حد تک اپنی جگہ پر معقول وجوہات اور استدلال پر مبنی ہے۔ ذیل میں علیحدہ علیحدہ ان چاروں ممالک کی قدیم علوم ریاضیات کا ذکر مختصر طور پر کیا جاتا ہے۔

چین اہل چین کا دعویٰ ہے کہ وہ سنہ ۱۷ ق۔م میں جو ابتدائی پتھر کے دور کا آخری زمانہ تھا علم نجوم میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ وہ Constellation سے واقف تھے۔ اور انہوں نے سنہ ۱۲۷ ق۔م میں منطقۃ البروج کی تقسیم بارہ[۱۲] برجوں میں کی تھی۔ اس معیار کو حاصل کرنے کے واسطے ظاہر ہے کہ ان کو وقت اور زاویوں کی پیمائش اور حساب کے ابتدائی اصولوں پر کافی دستگاہ ہو گی گو اہل چین اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں کوئی باقاعدہ وثیقہ نہیں رکھتے ہیں تاہم اس امر کے کافی استدلال موجود ہیں کہ ان کی ریاضیات بہت قدیم ہے شہنشاہ فوہی کے عہد میں جس کا زمانہ حکومت سنہ ۲۸۵۲ ق۔م تا سنہ ۲۷۳۸ ق۔م ہے۔ اہل چین علم فلکیات پر کافی دسترس رکھتے تھے۔ اس وقت انہوں نے منطقۃ البروج کو اٹھائیس[۲۸] حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اور ہر برج کو ایک جانور کی شکل سے ظاہر کیا تھا

۲۲۰۰ ق۔م۔ شہنشاہ ہانگ تی کی زیر پرستی میں لیشو نامی ایک شخص نے علم نجوم پر ایک کتاب لکھی۔ ایک دوسرے شخص تا نو نے اعداد و شمار کے واسطے ساٹھ کا معیار قائم کیا شہنشاہ کو خود بھی نجوم اور ریاضیات میں اتنی دلچسپی تھی کہ کہا جاتا ہے کہ اس نے بھی ایک تصنیف حساب پر اور ایک علم نجوم پر کی۔

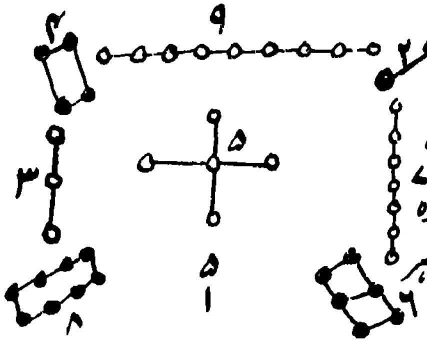
آئی کنگ
۱۱۵۰ ق۔م

اس کتاب میں اعداد کی تقسیم طاق و جفت میں کی گئی ہے چینی جفت عدد کو ئینگ (نر) اور طاق کو یِنگ (مادہ) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور ابتدائی آٹھ ہندسوں کو یوں ظاہر کرتے تھے۔



صفر ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷

ان ہندسوں کو خاص خاص آسمانی اثرات کا حامل سمجھا جاتا ہے اور خیر و برکت اور نیک شگون اور بلیات کے دفعیہ کی خاطر اب بھی چین اور تبت میں قطب نما۔ پنکھوں، گملوں اور گھر کے برتنوں پر یہ ہندسہ کندہ رہتے۔ اسی تصنیف میں طلسمی مربع اور اس کے اثرات کا تذکرہ ہے اور اس کو تعویذوں میں بھی لکھا جاتا ہے۔ ذیل میں لوشو نام کا ایک طلسمی مربع جو اس نسخہ میں ہے درج کیا جاتا ہے۔



لوشو۔ آئی کنگ سے اخذ شدہ سیاہ دائرہ (جفت) اور خالی دائرہ (طاق) اعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔

فی زمانہ
یہی طلسمی مربع یوں لکھا جاتا ہے

۴	۹	۲
۳	۵	۷
۸	۱	۶

اس طلسمی مربع کے متعلق ایک مشہور قصہ یہ ہے کہ جب شہنشاہ یو (۲۲۰۰ ق م) دریائے زرد، کے کنارے کھڑا ہوا تھا ایک آسمانی کچھوا ظاہر ہوا۔ اور اس کی پیٹھ پر

دو نقش کندہ تھے ان میں سے ایک ہی طاسمی مربع تھا۔

شاؤ پی۔ اس کتاب کے متعلق خیال ہے کہ اس کی تصنیف ۱۱۰۰ ق۔م۔ میں شہنشاہ شاؤ کنگ کے آخری زمانہ میں عمل میں آئی۔ یہ اہل چین کا خاص ریاضیات سے متعلقہ قدیم ترین نسخہ ہے۔ اس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے ہیں۔

(۱) اعداد کا فن دائرہ اور مربع سے حاصل ہوا۔

(۲) خط کی تقسیم کرو اور عرض کو (۳) اکائیاں اور طول کو (۴) اکائیاں رکھدو۔ تب گوشوں کا درمیانی فاصلہ ۵ ہوتا ہے۔

(۳) اشکال کروی یا نقطہ دار ہوتے ہیں۔ نمبرات طاق یا جفت ہوتے ہیں

(۴) آسمان ایک مدور راستہ پر گردش کرتا ہے۔ اس کے تحت اعداد طاق ہیں۔ زمین ایک مربع پر قائم ہے اس کے تحت اعداد جفت ہیں

اس تصنیف میں کیلنڈر یا تقویم کا بھی ذکر ہے۔ اس میں دن و رات کو ۱۲ گھنٹوں میں تقسیم کیا گیا۔ اور ہر گھنٹہ کو ۸ حصّوں میں۔ اس طرح ہر گھنٹہ موجودہ ۱۲۰ منٹ کا تھا۔ اور پھر گھنٹہ کا ہر حصہ ۱۵ منٹ کا تھا۔

نو حصص شاؤ پی کے بعد اپنی قدامت کے لحاظ سے اہل چین کی ریاضیات سے متعلقہ دوسری تصنیف ہے اس کے مصنف اور تاریخ تصنیف کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اتنا بادثوق استدلال کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ۱۰۰۰ ق۔م کی پیشتر کی کتاب ہے۔ یہ ایک بڑی حد تک علم الحساب کی کتاب ہے۔ اور اس میں تناسب، فیصد، شراکت، آمیزش، کمی و بیشی، کتے و خرگوش کی دوڑ، جذر اور جذر المکعب، ہمزاد مساوات اور مثلث قائم الزاویہ پر بحث ہے۔

ان تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اہل چین اپنی قدیم ریاضیات میں اپنے ہمعصر قوموں سے پیچھے نہ تھے۔ اور چین ان قدیم مہذب ممالک میں سے ہے جو ابتدائی علوم ریاضیات کی تشکیل کے پیشرو رہ چکے ہیں۔

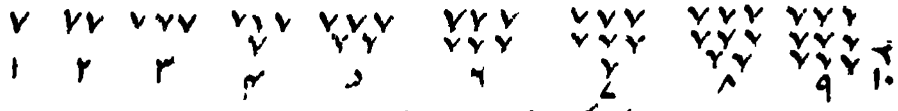
ہندوستان

اگرچہ ہندوستان کی تہذیب نہایت قدیم ہے اور یہاں کے آریہ نسل کے باشندوں کے دماغ قدرتاً ریاضیات کیلئے نہایت موزون تھے۔ لیکن ان میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ اچھے مورخ نہ تھے اور وہ اپنے بزرگان سلف کے کارناموں کو محفوظ رکھنے کے عادی نہ تھے۔ چنانچہ یہاں کے مستند قدیم تاریخی حالات کا صحیح پتہ اسلام کے پہلے حملہ (٦٦٤ء) سے قبل کا نہیں چلتا ہے۔ یہاں کی تاریخ ریاضیات کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے اس کے ماخذ یہاں کی دو قدیم مذہبی کتابیں مہابھارت اور رامائن ہیں۔ اس کے علاوہ تھوڑا بہت اندازہ یہاں کے چند قدیم سکوں اور کتبوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مہابھارت سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے کہ اس قدیم زمانے میں ہندوں کا اعداد و شمار سے متعلق معیار کیا تھا۔ سکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۰۰ برس قبل ریاضیات سے متعلقہ کس قسم کی علامات تشکیل پا چکی تھیں۔ ویدوں کی مقدس کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ سنہ ۱۰۰۰ ق۔م سے قبل علم فلکیات کی جانب بھی توجہ کیجاتی تھی اور وہ اپنے ہمعصر ممالک چین بابل اور مصر سے اس علم میں کسی طرح پیچھے نہ تھے۔

بابل

موجودہ عراق و عجم کا علاقہ جو دریائے دجلہ و فرات سے سیراب ہوتا ہے زمانہ قدیم میں کلدان یا بابل کے نام سے مشہور تھا۔ تاریخ ریاضیات کا قدیم مستند ریکارڈ جتنا اس علاقہ میں دستیاب ہوا ہے دوسری جگہ نہیں ملتا ہے۔ چونکہ اس علاقہ میں پتھر کمیاب ہے لہذا اہل بابل اپنی تواریخ اینٹوں پر کندہ کرتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ابتدا میں چکنی مٹی کی بڑی بڑی اینٹیں بنا لیتے تھے اور جبکہ وہ ابھی خام ہوتی تھیں کسی نوکدار چیز سے اس پر لکھ دیتے تھے اور بعد میں ان اینٹوں کو آگ میں پختہ کر لیتے تھے۔ مقام نیپر میں جو بابل سے جنوب کی طرف ایک قدیم شہر ہے اس قسم کی ۵۰ ہزار اینٹیں دستیاب ہوئیں ہیں۔ ان کتبوں کے متعلق خیال ہے کہ کسی کتب خانہ کا ایک حصہ تھا۔ ان کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۳۰۰۰ ق۔م میں بابل کے سوداگر بل، رسید اور کھاتوں کے اصول سے واقف تھے

اس زمانہ کے کتبوں پر جو ہندسے ملتے ہیں وہ ۱ تا ۱۰ تک یوں لکھے جاتے تھے۔ :



بڑے اعداد کے لکھنے کے لیے اور مختلف علامتیں تھیں مثلاً ۴۰۰۲ یوں لکھتے تھے۔ ۲ ۷ ۷ ۷ ۷ ۷۲ اس سے بڑے اعداد کے لئے وہ اہل روم کی طرح تفریقی اصول سے بھی کام لیتے تھے چنانچہ ۱۹ وہ یوں لکھتے تھے (۷۲، ۷۷) یہاں علامت --۷ نفی کے معنی دیتی ہے۔

سنہ ۵۰۰۰ ق۔م سے اہل بابل کا خیال تھا کہ سال میں ۳۶۰ دن ہوتے ہیں۔ اس بنا پر اس کے چھٹے حصہ ساٹھ کو معیار عدد قرار دیا تھا۔ اس عدد کو معیار قرار دینے میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ یہ عدد ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۱۰، ۱۲، ۱۵، ۲۰، ۳۰ پر پورا تقسیم ہو جاتا تھا اور اس وجہ سے بہت سی کسور جن کا نسب نما ۶۰ ہو نہایت سادہ اکائی کسر کی شکل میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ مثلاً $\frac{20}{60}=\frac{1}{3}$ و $\frac{15}{60}=\frac{1}{4}$ وغیرہ۔ خیال یہ ہے کہ موجودہ وقت کی اکائی منٹ اور سکنڈ کی بنیادیں یہیں سے پڑتی ہیں۔ اور درجن جو اس عدد کا پانچواں حصہ ہے اپنا وجود یہیں سے شروع کرتا ہے سنہ ۵۰۰۰ ق۔م کے بعد وہ علم نجوم میں نمایاں ترقی کر چکے تھے۔ چنانچہ سنہ ۲۷۰۰ ق۔م سے قبل وہ اپنی تقویم مکمل کر چکے تھے۔ اور اپنے سال کا آغاز سنہ ۲۷۰۰ ق۔م سے کرتے ہیں جبکہ سورج برج ثور میں تھا۔ اور اس سال کے اول کا نام اس بنا پر ماہ ثور رکھتے ہیں۔ اس وقت تک یہ لوگ یہ بھی تحقیق کر چکے تھے کہ سال ۳۶۵ دن ۶ گھنٹہ ۱۱ منٹ کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تقریبی صحیح پیمائش کے قبل وہ علم الارقام و حساب کے ابتدائی اصول زاویوں اور وقت کی پیمائش پر کامل دستگاہ حاصل کر چکے ہوں گے۔ سنہ ۳۱۰۰ ق۔م تا سنہ ۲۷۵۰ قائم تک سرغن نامی کسی فرمانروا کا زمانہ تھا۔ اس فرمانروا کا ایک دستی نسخہ پیرس کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ سرغن نے کسوف و خسوف کا

ایک باقاعدہ ریکارڈ جمع کیا تھا۔ اور اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اہل بابل کی ریاضیات کا معیار کیا تھا۔

بابل میں جو تختیاں ملتی ہیں۔ ان میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بتدریج ایک دوسرے سے سو سو یا دو دو سو برس بعد کی ہیں۔ اس سے وہاں کی تدریجی ترقی پر نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۲۸۰۰ ق۔م کے بعد سنہ ۲۲۰۰ ق۔م کی جو تختیاں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ قوم اعداد و شمار سے تجاوز کر کے مختلف پیمانوں کی بنیادی اکائیوں پر پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ مکعب فٹ پانی کے وزن کو وزن کے پیمانہ کی اکائی مانا گیا تھا اور اس اکائی کا نام 'تیلہا' رکھا گیا تھا۔ اس اکائی کے ساٹھویں حصہ کا نام 'مانہ' رکھا گیا۔ زمین کی پیمائش کی اکائی 'شر' اور سیال چیزوں کی پیمائش کی اکائی 'قا' کہلاتی تھی۔ سود کا لین بھی شروع ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ½ ، ⅓ ، ⅚ وغیرہ تماوی کسور سے بھی واقف ہو چکے تھے۔

سنہ ۲۴۰۰ ق۔م سے تین سو برس بعد جو کتابے ملتے ہیں ان میں ایک کتبہ پر ۱ تا ۶۰ اعداد کے مربع درج ہیں۔ اور دوسرے پر ۱ تا ۳۲ تک کے مکعب کا جدول ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں وہاں ہمورابی نامی ایک فرمانروا حکومت کرتا تھا۔ اسی زمانہ کے ایک اسکول کے کھنڈر بھی ملے ہیں۔ اس اسکول کی دیواروں پر جابجا ایسی تختیاں نصب ہیں جس پر اس وقت کے طلبا اپنے اسباق لکھتے تھے ان تحریروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان طلبار کے اسباق اعداد و شمار کے قاعدے، تجارتی حساب و کتاب اور مساحت کے قاعدوں پر مشتمل تھے۔ مقام نیپور پر جہاں ۵ ہزار تختیوں کا ذخیرہ ملتا ہے ان میں بعض بعض اسطوانہ کی شکل کے ہیں اور ان پر ضرب و تقسیم، مربع اور جذر کے جدول درج ہیں۔ اور اکائی کسور کا جن میں نسب نما ہمیشہ ۶۰ رہتا ہے۔ حساب بھی ملتا ہے۔ سنہ ۱۵۰۰ ق۔م کتبوں سے اس قوم کے علم ہندسہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اہل بابل مستطیل مربع، مثلث قائمۃ الزاویہ

اور منحرف کے رقبہ نکالنے کے قاعدوں سے واقف ہو چکے تھے۔ سنہ ۲۰۰۰ ق م تک اس قوم کی روزمرہ ضروریات زندگی میں اعداد صحیح، کسر اور لین دین کا حساب عام شکل اختیار کر چکا تھا۔

مصر جس طرح چین دریائے زرد سے، ہندوستان دریائے گنگا سے، عراق دریائے دجلہ و فرات سے سیراب ہوتا ہے۔ اسی طرح مصر دریائے نیل سے فیضیاب ہوتا ہے۔ مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مصر کی قدیم تہذیب اور ریاضیات بھی اسی دریا کی رہین منت ہے۔ چنانچہ دریائے نیل سے بغرض آبپاشی جو نہریں نکالی گئی تھیں ان کی قدامت سے مصریوں کی قدیم مساحت اور علم ہندسہ پر نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ بریں پانی کے اتار چڑھاؤ کی پیمائش کے لئے جو "نیل پیما" تیار کئے گئے تھے ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سنہ ۳۰۰۰ ق م سے پیشتر کی صنعت تھی۔ ان نیل پیما سے پجاری اپنے مندروں میں بیٹھکر دریائے نیل کے پانی کے اتار چڑھاؤ کی پیشین گوئی کرتے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایک چھوٹی نہر نیل سے مندر کے اندر تک آتی تھی۔ وہاں پانی کی سطح پر عوام کی نظروں سے پوشیدہ ایک "نیل پیما" ڈالدیا جاتا تھا۔ یہ نیل پیما اب بھی مندروں میں اپنی پوشیدہ جگہوں پر ملتے ہیں۔ پانی کے اتار چڑھاؤ کے مطابق اہل مصر نے سال کو تین فصلوں میں تقسیم کیا تھا آبی۔ فصلی اور تخمی۔ اس کے علاوہ سال کو ۳۰ دن کے ۱۲ مہینوں میں بھی تقسیم کیا تھا۔ اس طرح سال کے جملہ ۳۶۰ دن ہوتے تھے۔ اس میں ۵ دن "دعوتی ایام" کے شامل کرکے جملہ سال ۳۶۵ دن کا کر دیا تھا۔ اب بھی تقریباً $\frac{1}{4}$ دن کی غلطی تھی۔ اس طرح ان کے سال موسم کے اعتبار سے آہستہ آہستہ تبدیل ہوتے رہتے تھے اور ۳۶۵ × ۴ = ۱۴۶۰ سال کے بعد پھر اصلی حالت شروع ہوتی تھی۔ مصریوں کی یہ تقویم سنہ ۴۲۴۱ ق م سے شروع ہوتی ہے۔ اس تقویم کو مرتب کرنے کے لئے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اعداد و شمار، زاویوں اور وقت کی پیمائش اور ریاضیات کے دیگر شعبوں میں

اہل مصر کا معیار کیا تھا۔ اگر اس معیار پر پہنچنے کے وقت کا اندازہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اہل مصر کی باقاعدہ ریاضیات کی ابتدا پتھر کے وسطی زمانہ تک پہنچتی ہے۔

اہل مصر کی قدیم انجنیری سے ان کی ریاضیات کا بھی سراغ ملتا ہے۔ پتھر کی تراشی ہوئی دنیا میں پہلی عمارت کی تعمیر مصر میں سنہ ۳۰۰۰ ق۔م سے تقریباً ایک صدی پہلے ہوئی۔ سنہ ۳۰۰۰ ق۔م کے بعد انجنیری میں نہایت سرعت سے ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ سنہ ۲۸۰۰ ق۔م میں غزہ کے اہرام مصر کی تعمیر جو دنیا کے ہفت عجائب کے نام سے مشہور ہے عمل میں آئی۔ گو اس زمانہ کا کوئی کتبہ نہیں ملتا ہے مگر اہرام مصر کے فن انجنیری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اہل مصر علمی مساحت اور علم ہندسہ میں بہت کافی ترقی کر چکے تھے۔ چنانچہ ان اہرام کے اضلاع کی پیمائش سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ ۳/۴ انچ کی غلطی ہے۔ یہ کل کے طول کا ۱/۱۴۰۰۰ واں حصہ ہوتا ہے۔ اور اس کے زاویوں میں ۱/۲۰۰ درجہ کی غلطی ہوتی ہے جو قائمہ کا ۱/۱۸۰۰۰ واں حصہ ہے۔ ان اہرام کی ساخت کے متعلق ایک نظریہ یہ تھا کہ چار مثلثات مساوی الاضلاع ایک دوسرے سے متحدہ تعمیر کئے گئے ہیں لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قاعدہ کا طول مائل اضلاع معتد بہ بڑا ہے۔ ایک دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اہرام کے طول اور اس کی بلندی میں ایک خاص نسبت رکھی گئی ہے جو اضلاع کے دو چند طول کو بلندی سے تقسیم کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ وہی نسبت ہے جو دائرہ کے محیط کو اس کے قطر سے تقسیم کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو اہل مصر محیط کی علامت π اس کی قیمت اور مفہوم سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ قدیم مصری عمارتوں کی دیواروں پر جو نقش و نگار ہیں ان میں ایک دیوار پر ایک دفتر کی کیفیت ظاہر کی گئی ہے۔ اس دیوار پر اہلکاران دفتر نیم برہنہ کسانوں سے ٹیکس وصول کر رہے اور وصول یابی کی رسیدیں مرتب کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل مصر اس وقت تک اپنے حساب

و کتاب میں اس درجہ پر آ چکے تھے کہ وہ اپنے میں کھاتہ، بل اور ٹیکس کی فہرست وغیرہ مرتب کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

احمیز تقریباً سنہ ۱۵۵۰ ق م میں مصر میں احمیز نامی ایک شخص گذرا ہے جس نے ریاضیات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے طرز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی قدیم کتاب کا ترجمہ ہے جو سنہ ۳۴۰۰ ق م میں تصنیف ہوئی مثال کے طور پر احمیز لکھتا ہے "یہ کتاب چہارم ماہ سوری تینتیسویں سال میں شاہ رؤس کے سرپرستی میں ایک قدیم تصنیف کے نمونہ پر جو شاہ ایٹ (خیال ہے کہ مخفف ہے نام اینمہ ایٹ کا جو سنہ ۱۸۵۰ ق م میں گذرا ہے) کے زمانہ میں مرتب ہوا تھا لکھی گئی ہے۔ یہ قلمی نسخہ جو ایک قدیم ساخت کے کاغذ پہ ہے مسٹر اے۔ ہنری رائینڈ نے انیسویں صدی میں مصر سے خرید کیا اور اب برطانیہ کے عجائب خانہ میں ہے۔ یہ نسخہ ایک نوٹ بک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا عنوان "ہدایات برائے حصول پوشیدہ علوم" ہے۔ اور اس میں اختصار کے ساتھ مساوات مفرد، اکائی کی کسرات، ہارمونک و جیومیٹرک سیریز، ابتدائی علم ہندسہ، مساحت پر بحث کی گئی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ احمیز کے نسخہ میں اعداد صحیح کا ذکر بالکل نہیں ہے اور کسور کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ احمیز اکائی کی کسرات پر اکتفا کرتا ہے۔ کسرات لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ نسب نما لکھ کر اوپر ایک نقطہ یا رو نام کی علامت بنا دیتا ہے۔ مثلاً احمیز $\frac{1}{42}$ = "۔" یوں لکھتا ہے جس میں نقطہ مساوی ایک و بٹا کی علامت کی بجائے ہے اور "ـــ" = ۴۲ کے ہے۔ اور ایسے کسور جن کو اکائی کے طریقہ پر نہیں لکھا جا سکتا ہے اُن کو وہ اجزا میں تحلیل کر کے مجموعہ کے طریق پر لکھتا ہے مثلاً $\frac{2}{9} = \frac{1}{6} + \frac{1}{18}$ ‏ $\frac{2}{3}$ کے لئے وہ ایک خاص قسم کی علامت ☆ لکھتا تھا۔ کسی کسر کو اُس کی اکائیوں کی کسروں میں تحلیل کرنے کے لئے احمیز نے ایک جدول دے رکھا تھا۔ جس میں تمام کسرات جو $\frac{2}{2ن+1}$ (ن = ہندسے

۱ تا ۴۹) کی شکل کی ہوتی ہیں اکائی کی کسور میں تحلیل کی جا سکتی تھیں۔ مثلاً وہ اس جدول کی مدد سے $\frac{2}{43} = \frac{1}{42} + \frac{1}{86} + \frac{1}{129} + \frac{1}{301}$ کے لکھتا ہے۔ اگرچہ $\frac{2}{43}$ اور بھی مختلف صورتوں میں تحلیل ہو سکتا ہے۔ مثلاً

$$\frac{2}{43} = \frac{1}{43} + \frac{1}{42} = \frac{1}{30} + \frac{1}{86} + \frac{1}{645} = \frac{1}{24} + \frac{1}{258} + \frac{1}{1032} = \frac{1}{24} + \frac{1}{860} + \frac{1}{1290}$$

وغیرہ یہ امر ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ احمیز نے $\frac{2}{43}$ کو صرف ایک ہی طریقہ پر کیوں اور کیسے تحلیل کیا؟ وہ کسرات کی ضرب کا بھی ایک مخصوص طریقہ بیان کرتا ہے۔ مثلاً $\frac{2}{3} \times \frac{1}{5}$ کو وہ یوں بتاتا ہے۔ "اگر تم سے کوئی یہ سوال کرے کہ $\frac{2}{3}$ کا $\frac{1}{5}$ کتنا ہوتا ہے تو اسی کا دوچند اور اسی کا چھ گنا لو یعنی اس کا $\frac{1}{4}$۔ دوسری کسرات کے ضرب کا بھی یہی طریقہ ہے"

چونکہ $\frac{2}{3} = \frac{1}{2} + \frac{1}{6}$ ہے احمیز کا مطلب یہ ہے $\frac{2}{3} \times \frac{1}{5} = \frac{1}{5\times 2} + \frac{1}{5\times 6}$۔ احمیز کے نسخہ میں اس طرح مخلوط کسروں کی ضرب کی سترہ مثالیں ہیں۔

احمیز کے نسخہ میں الجبرے کے ۱۱ مسائل ہیں جو سادہ مساوات کی شکل میں تحویل ہو جاتے ہیں اور اُن کا طرز لا + $\frac{1}{7}$ لا = ۱۹ کی شکل کا ہے۔ وہ نامعلوم عدد کو ہاؤ کہتا ہے۔ ایک مسئلہ الجبری طریق پر یوں لکھتا ہے۔ "ہاؤ (ڈھیر) اُس کا $\frac{2}{3}$، اُس کا $\frac{1}{2}$، اُس کا $\frac{1}{7}$، اُس کا کل = ۳۳" موجودہ علامات میں یہ یوں لکھا جاتا ہے $\frac{2}{3}$ لا + $\frac{\text{لا}}{2}$ + $\frac{\text{لا}}{7}$ + لا = ۳۳۔ احمیز اس کا حل بھی اپنے مخصوص قدیم طرز پر یوں دیتا ہے۔

" ۱ . $\frac{2}{3}$. $\frac{1}{2}$. $\frac{1}{7}$ ہاؤ = ۳۳

تب ۱ $\frac{2}{3}$ $\frac{1}{2}$ $\frac{1}{7}$ جیساکہ اوپر بتایا گیا ہے ضرب دیا جاتا ہے تاکہ ۳۳ ہو جائے۔ اس طرح پر ڈھیر مساوی ہوتا ہے ۱۴ $\frac{1}{4}$ $\frac{1}{97}$ $\frac{1}{56}$ $\frac{1}{679}$ $\frac{1}{776}$ $\frac{1}{194}$ $\frac{1}{388}$۔ اس طرح الجبری مساوات کا حل ۱۴ $\frac{28}{97}$ حاصل ہوتا ہے جو کہ اکائی کی کسروں میں احمیز نے ظاہر کیا۔ جمع۔ تفریق اور مساوات کے لئے علامات استعمال ہوتی تھیں، ذیل میں احمیز کی ایک مساوات کا

نمونہ نقل کیا جاتا ہے ۔



یہاں ◯ = ۲/۳ ، ⊂ = ۱/۲ دیگر اکائی کسرات اعداد لکھکر ⬭ رو کی علامت اوپر درج کر دیتے ہیں۔ احمیز کے اس نسخہ میں حسابی اور ہندسی تسلسلات کی بھی مثالیں ہیں۔ مثلاً احمیز ایک سوال اس طرز کا دیتا ہے۔ ۱۰۰ روٹیوں کو ۵ آدمیوں میں اس طرح تقسیم کرو کہ ۱/۷ اس حصہ کا جو اولیں ۳ آدمیوں کے حصہ میں آوے آخری دو آدمیوں کے حصوں کے مساوی ہو۔ دونوں کا فرق کیا ہے؟ احمیز اس حل کو یوں بیان کرتا ہے۔

" فرق ۵ ۱/۲ بناؤ ۲۳ ۱۷ ۱/۲ ۱۲ ۶ ۱/۲ ۱
پھر ۱ ۲/۳ پر ضرب کرنے سے ۳۸ ۱/۲ ۲۹ ۱/۲ ۲۰ ۱۰ ۲/۳ ۱/۶
اور ۱ ۲/۳ "

احمیز کا یہ حل بالکل قیاسی معلوم ہوتا ہے ۔

فی زمانہ حسابی تسلسل سے یہ سوال یوں حل ہوتا ہے ۔

ن یا جملہ اعداد = ۵ مجموعہ = ۱۰۰ اور (ا+۴د) + (ا+۳د) + (ا+۲د)
= (ا+د) + ا

لہٰذا ۱۰۰ = مجموعہ = (۲ا+۴د)/۲ × ۵ = ۶۰ ا

لہٰذا ا یا پہلا حصہ = ۱ ۲/۳ اور د یا فرق = ۹ ۱/۶

لہٰذا سلسلہ = ۱ ۲/۳ ، ۱۰ ۵/۶ ، ۲۰ ، ۲۹ ۱/۶ اور ۳۸ ۱/۳

دوسرا مسئلہ جو فی زمانہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے یہ تھا۔ دس اناج کے تھیلے دس آدمیوں میں اس طرح تقسیم کرنا ہیں کہ ہر شخص ماقبل سے ۱/۸ کم پائے ۔

اس کا جواب $1\frac{9}{16}$ ، $1\frac{7}{16}$ ، $1\frac{5}{16}$ .. . $\frac{9}{16}$ اور $\frac{7}{16}$ ہے احمیز نے اپنے قیاسی حل کے ذریعہ اکائی کسور میں یہی جواب دیا ہے۔

ہندسی سلسلہ کا سوال بھی دلچسپ ہے۔ جو ہماری زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ایک خاندان ۷ افراد پر مشتمل ہے۔ ہر شخص کے پاس ۷ بلیاں ہیں۔ ہر بلی ۷ چوہے کھاتی ہے ہر چوہا جو کی ۷ بالیوں کو کھا کر چھلکوں میں تبدیل کرتا ہے۔ اور ہر بالی کی بھوسی کے واسطے ۷ پیمانوں کی ضرورت ہے۔ اشیاء کی جملہ تعداد بتاؤ۔ احمیز اس حل کو یوں لکھتا ہے۔

خاندان ۷
بلیاں ۴۹
چوہے ۳۴۳
بالیاں ۲۳۰۱
تھیلیاں ۱۶۱۰۷
جملہ ۱۸۸۰۷

احمیز کے الجبرے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں حساب اور الجبرا ایک دوسرے سے وابستہ تھا۔ فی زمانہ ہم اپنی تعلیم میں ہر دو مضامین میں کوئی ربط نہیں رکھتے ہیں۔ اور الجبرا حساب سے علیحدہ کر کے ایسے پڑھایا جاتا ہے۔ گویا یہ کوئی رموز اور علامات کا علم ہی علیحدہ ہے۔ یہ طریقہ اصولاً غلط ہے بنی نوع انسان کے قدرتی طریقہ کے مطابق الجبرے کا اختراع حساب سے ہونا چاہیئے۔

تدریس تاریخ ہند

از

مولوی سعید الدین خاں صاحب بی۔اے۔ ڈپٹ ہیڈ۔ ہندوستانی شاہ عالم بلڈنگ

قطع نظر ان مطامح اور طریقہ ہائے تدریس تاریخ کے عام مسائل کے۔ مدرسین تاریخ ہند کی ہندوستانی مدارس میں چند خاص ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن سے بحث کرنا اس مضمون کا مقصد ہے۔ ہم نے یہ اکثر کہتے ہوئے سنا ہے کہ تاریخ ہند جس طرح کہ اس کو نصابی کتب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس پر نہ تو "ہندوستانی" ہی کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ "تاریخ" کا تاریخ ہند میں جو بھی نمایاں اور زندہ جاوید واقعات ہیں ان کی مکمل اور صحیح تفصیل ایک ہندوستانی کے زبانی ہندوستان کے لئے ہونی چاہیئے۔ اس خالص سودیشی پن کو سراہتے وقت ہمیں قومیت کی ان عجیب وغریب چالاکیوں سے جو واقعات تاریخ پر اثر انداز ہوتی ہیں خبردار رہنا پڑتا ہے اور مدرس تاریخ ہند کو اس معاملہ میں بہت احتیاط برتنی پڑتی ہے کہ مبادا وہ کسی ہندوستانی چیز کی تعریف محض اس لئے کرے کہ وہ غیر ہندوستانی نہیں ہے اس کو اگر ایک طرف برسوں کی خاطر جمعی یا جمود کو دور کرنا اور اپنے طلبا میں حقیقت اور ضرورت کے احساس کو اجاگر کرنا پڑتا ہے تو دوسری طرف محض قدامت یا پس ماندگی کی تحسین سے انہیں باز رکھنے کی تمام تر ذمہ داری بھی اسی پر عاید ہوتی ہے۔

مدرس تاریخ کا اگرچہ یہ بھی فرض ہے کہ آجکل تعمیر و ترقی کے دیگر جدید وسائل کو نظر انداز کر کے محض سیاسی پہلو پر جو نامناسب زور دیا جا رہا ہے اس کی اصلاح کرے لیکن اسا طالب علم جس کو تاریخ ساز ہستیوں یعنی بادشاہ، سپاہی اور سیاست داں کی قدر و منزلت کرنی سکھلائی گئی ہے یقیناً قابل معافی ہے اگر زمانہ مابعد میں وہ بیاس کو شاعر،

مسور اور پیغمبر پر ترجیح دے کر اس کی پرستش کرنے لگے۔ جے۔ بی۔ ایس۔ ہالڈین کہتا ہے "مورخین نے شاید ہی کبھی اس کا یقین کیا ہو کہ انسان کے ہاتھ بہ نسبت اس کے منھ کے زیادہ فطری اور اہم ہیں" "ہم کو چاہیئے کہ تاریخ کو محض نام اور تواریخ کی فہرست بنا کر اس کو ذلیل نہ کردیں نیز ایسے معلومات کے فراہم کرنے سے احتراز کریں جن سے بقول۔ ایل۔ پی۔ جیاکس "طلبا کوئی فائدہ جو سماجی طرز پر قابل قدر اور ذاتی طور پر قابل حظ ہو نہیں اٹھا سکتے اور جن کو وہ آخر میں فراموش کرجاتے اور شاید ان سے نفرت بھی کرنے لگتے ہیں"

مسائل پیش کشی

ایس طالب علم کو اگر کچھ حاصل کرنا ہی ہے تو وہ غیر متعلق واقعات کا اپنے دماغوں میں ٹھونسنا نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف قابل قدر زمانوں کی واضح تصاویر کے ایک سلسلہ کا اکتساب کرنا اور اس کا ایقان کرنا ہے "امن وصلح کی کامرانیاں جنگ سے کچھ کم شاندار نہیں ہوتیں" اور یہ کہ فیصلہ کا صحیح معیار اور قدر وقیمت کا حقیقی احساس ہی مطالعہ تاریخ کا اہم نتیجہ ہیں۔ اس سلسلہ میں تدریس تاریخ ہند کی ایک اہم مشکل کا بیان بھی ضروری ہے یعنی جب تاریخ ہند کے ایسے واقعات وادوار کا سبق ہو، جن سے قومی نفرت کی آگ جس کو بجھے ہوئے مدت ہو چکی ہے، دوبارہ بھڑک جانے کا اندیشہ ہو تو استاد کو چاہیئے کہ حتی الامکان وہ سائنٹفک طریقہ استعمال کرے یعنی اس کشیدگی کو تصوریت کا درجہ دے دے اور انسانیاتی Humanistic طریقہ سے (یعنی قوتوں کو جیتا جاگتا بنانے سے) گریز کرے۔

تدریس تاریخ ہند میں جو دوسری چیز ممد ہو سکتی ہے حتیٰ کہ مدارس ثانویہ میں بھی وہ طلبا کو ماخذ تاریخ کی کسی ایک قسم یا قسموں سے روشناس کرانا ہے۔ اس سے یقیناً ان میں تمام انسانی چیزوں سے متعلق ایک خاص تجسس کا مادہ پیدا ہوگا اور مابعد کی زندگی میں غیر اہم چیزوں سے تاریخی نتائج کے اخذ کرنے کی عادت ترقی پائے گی۔ نیز طلبا کو مورخ کے مشکل کام کی قدر اور اس کا احساس کرانے کے لیے کہ اس کو مختلف مقامات سے کس طرح واقعات کو جمع کرکے ترتیب دینا پڑتا ہے چند کتبات کو جماعت میں پڑھا جا ہے، چند مسی لوحیں اور سکے دیکھنے کے لئے دئیے جا سکتے ہیں اور قدیم تاریخی مقامات

معائنہ کے لیے تعلیمی تفریح کا انتظام کیا جا سکتا ہے اس سے ہوگا یہ کہ وہ مورخ کے اکثر مذبذب نتائج سے ہمدردی ظاہر کریں گے اور ناکافی شہادت پر فوری نتائج کے اخذ کرنے سے گریز کریں گے اور ان تمام ثنا بانہ تعبیرات پر مستفسرانہ نظر ڈالیں گے۔

تاریخ ہند کے یوں تو بہت پیچیدہ مسائل ہیں لیکن یہ ایک بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے کہ تاریخ کس قدر سکھلائی جائے اور موجودہ نسل کو شاہراہ ترقی پر لگانے کے لئے اس امتزاج میں سے کتنا حصہ انتخاب کیا جائے؟ اگر یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے طلبا کو آٹھ ہزار برس کی بوقلموں تاریخ کی کامل وسعت اور سرزمین کی ہر ایک تفصیل سے واقف کرا سکیں تو آخر ہمیں پھر کس چیز کی اہمیت جتلانی چاہیے جبکہ انتخاب کے اصول بھی سال بہ سال بدلتے جاتے ہیں؟ چنانچہ مارک پیاٹسن رقمطراز ہے" یہ اس لئے نہیں ہے کہ نئے واقعات کا مسلسل اجتماع ہو رہا ہے اور نہ اس لیے ہے کہ تنقید سخت ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور نہ اس لیے کہ طرز نگارش بدلتی جا رہی ہے بلکہ اس لیے کہ خیالات بدلتے جاتے ہیں اور مختلف چیزوں کو ہر زمانہ میں دیکھنے کا معیار بدلتا جاتا ہے۔ لہذا ہر نسل کو اس بات کی ضرورت ہے کہ واقعات کو اپنے سانچے میں دوبارہ ڈھالے اور اپنے نقطہ نظر سے اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ دوبارہ لکھوائے"۔ ایف۔ جے۔ برینڈلے کہتا ہے" ماضی حال سے مختلف ہوتا ہے اور اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے کیونکہ ہمیشہ وہ حال ہی ہوتا ہے جس پر کہ ماضی کا انحصار ہوتا ہے" اس نقطہ نظر سے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ ہند کے وہ کون سے ابواب ہیں جن کو ثانوی مدارس کے نصاب میں جگہ ملنی چاہیے؟"

مختصراً دو چیزیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ پہلے تو ماضی کے وہ تمام عناصر ہیں جو موجودہ سماجی، سیاسی ہندوستان کی مختلف ثقافت (کلچر) کی بنیادیں ہیں اور جنہیں ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ مثلاً طریقہ خاندان مشترکہ، فرقہ بندی۔ دیہی جماعت، تحریک بھکتی وغیرہ [illegible] حقیقی معنوں میں آجکل موجود ہیں، اور بقول [illegible] ہمارے ماضی [illegible] تشکیل کرتے ہیں۔ دوسرے ہمارے ملک کی [illegible] تاریخ کے [illegible] [illegible] ہے جو موجودہ دور تشکیل قومیت کے مشابہ ہیں، ہمارے کام کو

ترغیبی اور الہامی قوت عطا کر سکتے ہیں مثلاً ماضی کی عظیم کلچرل اٹھان، ہندوستان کے ثقافت کی دوسرے ممالک میں اشاعت، عہد مہاتما بدھ، شنکرا، رامانوجا، انڈو مسلم کلچر اور سلطنت وجیانگر، مرہٹے اور سکھوں کی ترقی۔

کروس کے قول کے مطابق "چونکہ تاریخ کا آخری مقصد ہم کیا ہیں اور ہمارا موقف کیا ہے اس کے متعلق ایک بیان دینا ہے" اس لیے تاریخ ہند کے حق میں اساتذہ کو دوسرے دو معاملات کی نسبت توجہ کرنی چاہیے۔ میازین کہتا ہے "ہر قوم اپنی ایک مخصوص اعانت کے ذریعہ دنیا کی ترقی میں حصہ لیتی ہے"۔ ڈی۔ ڈی گیس کا خیال ہے جس طرح موسیقی میں اس کے لوازمات (Obligations) یعنی آواز کی تھرتھراہٹ ترنم، ہم آہنگی، آرائش و زیبائش سے چار چاند لگ جاتے ہیں اور سُر کے مرکزی مقصد میں بگاڑ نہیں ہوتا یہی حال قوم کی تاریخ کا ہے" شائد تاریخ ہند کی اصلی غایت مثل ہندی فلسفہ، حسن کاری، سیاسیات اور معاشیات کے سماتیا، یوگا، ترکیب اور اتحاد رہا ہے اس لیے ویدانت کے تصور الوہیت میں (جس کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے) نیز قومی شعور میں ہم اسی کو سرایت کیا ہوا پاتے ہیں۔ بہرحال تاریخ ہند کے ہر باب کے ذریعہ ہم اسی مقصد کو تکمیل کی کوشش میں مصروف معلوم کر سکتے ہیں تاریخ کے پریشان کن استعدادات کے درمیان اس کا دریافت کرنا گوامر دشوار ہے لیکن یقیناً یہ ماہرین تعلیم کے حیطۂ اختیار سے باہر نہیں ہو سکتا کہ وہ اسباق کی ایک ایسی اسکیم تیار کریں جس کی مدد سے ہر اس طالب علم کو جو ثانوی مدرسہ کو چھوڑتا ہے، ہندوستان کی اس مادی قسمت کا شعور جو قرنوں سے چلی آرہی ہے دلایا جا سکے۔ ہندوستان میں ویدانتی تمدن کی اشاعت، بدھ مت، جین مت اور مختلف فلسفیانہ مذاہب کا عروج سلطنت موریا و گپتا کا عہد زرین، انڈو مسلم کلچر، مسلمانوں کی حکومت پر ہندی ردعمل، ہندوستان کا سیاسی اتحاد اور موجودہ نشاۃ جدیدہ کا علم، ہر ہندوستانی کے دماغ میں یہ ذہن نشین کرنے کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ عزت و ایمان اس کو ملک کی خدمت میں ثابت قدم رکھیں گے۔

انتباہ

تاریخ ہند کے اساتذہ کی ایک خاص ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ آیا حب الوطنی جس کی کہ انہوں نے پرداخت کی وہ دیوانہ پن میں تنزل تو نہیں کر رہی ہے لہذا ہر قدم پر احتیاط برتنی چاہیئے کہ افق نظر ہمالیہ اور کالے پانی سے پرے وسیع تر ہوتا چلا جائے۔ سندھی تمدن کے زمانہ سے ہندوستان دنیا سے متصادم ہو رہا ہے اور دنیا ہندوستان سے۔ قوموں کی بڑی تحریکات اور زمانہ ماقبل تاریخ میں ثقافتوں کی منتقلی، چین و جاپان اور بحری دنیا (Oceanic World) سے مشرق میں اتصال اور ایرانی، یونانی اور رومنی دنیا سے مغرب میں اتصال، اسلام کا عروج یوروپین رقابتوں کا گرداب (جن میں کہ ہندوستان پھنس گیا) اور موجودہ برطانوی دولت عامہ اور دنیا میں اس کا عجیب و غریب موقف —— ان تمام چیزوں کو اس اسکیم میں شامل ہونا چاہیئے جن کی مدد سے ہم ہونے۔ اے رانے د ہندؤں کی تربیت کی امید کر سکتے ہیں۔ ہر جماعت میں دنیا کا ایک بڑا نقشہ آویزاں ہونا چاہیئے تاکہ طلبا کے دلوں میں دنیا کا درد پیدا ہو جائے اور وہ قومیت کو پھیلنے والی تقاریر سے جو سر راہ ادھر ادھر ہوتی رہتی ہیں احتراز کرنے لگیں۔

خوش قسمتی سے ہندوستانی طلبا میں دنیوی لحاظ کا پیدا کرنا اور ترقی دینا مشکل امر نہیں ہے کیونکہ یہ ہندوستانی کلچرل وقوف کی بنیاد ہے۔ ہندوستان نے ہمیشہ سے اپنے خزانے کے منہ اپنے ہمسایوں کے لیے کھول رکھے ہیں لیکن شائد ہی کبھی اس نے اپنے دندان آز دوسروں پر تیز کیے ہوں۔ اسٹرابو کا کہنا ہے کہ یہ روک تھام —— الفاظ پر غور کیجیے —— "احساس نصفت پسندی" کا سبب تھی۔ حال ہی میں اس خیال نے بہت اہمیت حاصل کر لی ہے کہ ہندوستان کی قسمت میں دنیا کا قائد بننا ہے اور مغرب کی فریب خوردہ قومیں ایک روز راز قناعت معلوم کرنے کے لیے اس کے آگے سر بجبیں ہونگی۔ لیکن اس راہ قیادت میں کم از کم ہندوستان کے دو بڑے رقیب چین اور روس ہیں۔ چنانچہ شاہزادہ رڈووسکی کی حسب ذیل تقریر سے جو جنگ سے پہلے کی ہے اور جو اس نے ہندوستان میں پبلک موقع پر کی تھی اس پر روشنی پڑتی ہے "مغربی یورپ

ایک عجیب اور اداس منظر پیش کر رہا ہے۔ رائے رائے سے، قوت قوت سے، حکومت حکومت سے بر سر پیکار ہے۔ سائنس، آرٹ اور مذہب، سماجی زندگی کے تین بڑے محرکوں نے اپنی قوت زائل کر دی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے اور یہ چند سال میں خود بخود ظاہر ہو جائے گا کہ مغربی یورپ تباہی کے راستہ پر گامزن ہے۔ برخلاف اس کے ہم روسی تر و تازہ اور نوجوان ہیں اور یورپ کے جرائم میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ہمیں ایک بہت بڑے مقصد زندگی کو پورا کرنا ہے۔ ہمارا نام ابھی سے فتح کی لوح پر کندہ ہے، سائنس آرٹ اور مذہب کی کامگاریاں متزلزل یورپ کے کھنڈرات پر ہمارا انتظار کر رہی ہیں" اس قسم کے جذبات بعض مرتبہ جماعت میں بھی جبکہ تاریخ ہند کا سبق ہو رہا ہو منظر عام پر آجاتے ہیں اور شائد یہ لاعلاج بھی ہے۔ لیکن استاد کو اس قسم کے خیالات سے تعمیری کام لینا چاہیے۔ ہندوستان کو آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ مطابقت و مناسبت ہے استاد کو اس لیے اس قسم کی تمام گزشتہ صدیوں کی تہذیب کے تصادم کے مواقع پر زور دینا اور بتلانا چاہیے کہ ہندوستان نے ان حالات کا کس صورت میں جواب دیا ہے اس کو اپنے طلبا کو اس بات کا یقین دلانا چاہیے کہ ہندوستان کے "آنے والے استحقاق" کا مطلب مطامح کے مطابق زندگی بسر کرنے کی مزید ذمہ داری ہے نیز ان میں اس بات کا احساس پیدا کرانا چاہیے کہ ان کی دیانت دارانہ اور جان بخش خدمات کے ذریعہ ہندوستان کو سرسبز اور آسودہ بنانا چاہیے تاکہ دنیا کی خوش حالی اور اقبال مندی کا اطمینان حاصل ہو سکے۔

پس اگر دیکھا جائے تو قطع نظر مدرسہ کے دوسرے اساتذہ کے مدرس تاریخ ہند ہی کے کندھوں پر قومی تعمیر کی رہبری و تشکیل کا بوجھ ہے اس لیئے نہ صرف نئی ہندوستانی تاریخ کے نصاب کی تیاری کا کام موجودہ قومی ضروریات کی روشنی میں بہت زیادہ غور و فکر کا محتاج ہے بلکہ اس کے طریقہائے تدریس میں بھی فوری تبدیلیاں ہونی چاہئیں تاکہ ایک طرف ہندوستانی مدارس کو تاریخ کے مطامح اور ہندوستان کے بہترین قائدین کی سطح پر لایا جا سکے تو دوسری طرف طلبا کو روح آزادی سے روشناس کرایا جائے۔

(ماخوذ) زندگی از طوف دیگر زستن است   خویش را بیت الحرم دانستن است! (اقبال)

طلبہ کے لمحاتِ فرصت

از

مولوی سید غلام محمود صاحب اول مددگار مدرسہ وسطانیۂ اردو شریف

جس طرح کسی شخص کے اخلاق کی صحیح جانچ کرنے کے لیئے اس کے اوقاتِ کار کے ساتھ اوقات فرصت کے مشاغل کا جاننا بھی نہایت اہم و ناگزیر ہوتا ہے اور جس کے بغیر کوئی رائے صائب و مستند نہیں ہوسکتی بالکل اسی طرح دنیا کا کوئی نصاب تعلیم بھی اصل مقصد کے حصول کا ضامن نہیں ہوسکتا جس میں طلبہ کے اوقات کار کا نظام تو مکمل ہو مگر اوقات فرصت نظرانداز کردئے جائیں۔ اس طریقۂ عمل کی تمثیل بعینہٖ ایسی ہے کہ کسی مریض کو بہتر سے بہتر دوا تو کھلائی جائے مگر پرہیز نہ کرایا جائے۔ ظاہر ہے کہ دوا اکسیر و نافع ہونے کے باوجود صلاح نہ شد بلا شد کا مصداق ہوجائے گی اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ جب کسی مسئلہ کے دو جزو ہوں اور ان میں سے ایک تو ملحوظ رہے اور دوسرا نظرانداز ہوجائے تو امکانی کوشش کے باوجود بھی کوئی صحیح حل ہرگز برآمد نہیں ہوسکتا بہ الفاظ دیگر اگر کوئی شخص تصویر کا ایک ہی رخ دیکھے اور اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرکے یہ سمجھ لے کہ وہ بے کم و کاست حقیقت حال پر مبنی ہے تو وہ بجائے خود اس قدر غلط ہوگا کہ عمر بھر تلاش کرنے پر بھی حقیقت کا ایقان تو کیا گمان تک نہ ہوسکیگا۔

نصاب تعلیم کی اس ناقابل نظرانداز خامی کے بعد خود اساتذہ کی اس مسئلہ سے بے تعلقی مزید برآن ستم شعاری ہے چنانچہ اگر کسی استاد سے کہا جائے کہ طلبہ کے اوقات فرصت کی ذمہ داری بھی آپ ہی پر ہے تو اس کو اپنی ساری عمر کا یہ پہلا موقع ہوگا اور اکثریت اسی غلط ذہنیت کا شکار نظر آئے گی اور معدودے چند افراد جو اس کو اپنے فرائض کا اہم ترین جز خیال کرتے ہیں ان کا عدم وجود اس لئے برابر ہے

کہ جس فرض کو سب اکٹھے ہو کر بھی کما حقہ نہ ادا کر سکتے ہوں وہ معدودے چند افراد سے کیونکر بدرجہ اتم پورا ہو سکتا ہے۔

متذکرہ نصاب تعلیم ادیب، شاعر، مورخ، منشی، اہلکار، سائنس و ریاضی داں تو یقیناً پیدا کر سکتا ہے لیکن اچھے شہری کے پیدا کرنے کی اس سے توقع کرنی ایسی ہے جیسی کاغذی ابری سے بارش کی امید جو کبھی پوری ہوئی ہے اور نہ ہوگی اور ہو بھی کیونکر سکتی ہے کہ جس کی ضمیر ہی میں جو چیز موجود نہ ہو اس کا ظہور کسی رنگ میں بھی ممکن نہیں ہوتا ہے

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت   دماغ بے ہودہ پخت و خیال باطل بست

کسی قوم اور کسی ملک کو ایک اچھے شہری سے بڑھ کر کسی دوسری نادر الوجود ہستی کی احتیاج حقیقتاً نہیں ہو سکتی۔ تاریخ شاہد حال ہے کہ مادر گیتی نے ہمیشہ اچھے شہری پر نسبتاً زیادہ فخر ومباہات کیا ہے اور کرے گی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک اچھا شہری نصاب تعلیم کی ساری برکتوں سے مالا مال اور تمام بذل وعطا کا حامل ہو لیکن اس امر کا بعید ترین امکان تک نہیں ہو سکتا کہ کوئی نصاب تعلیم کا ہمہ داں فیض یاب لازماً اچھا شہری بھی ہو سکے گا اگر کسی کو نصاب تعلیم کی بدولت سب کچھ حاصل ہو جائے مگر اچھا شہری بننا نصیب نہ ہو سکے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ ساری عمر تو یکے بعد دیگرے حج کرنے میں بسر ہوئی پھر بھی سعادت مند نہ ہوئے اور وہی پاپی کے پاپی رہے۔

یہ کہنا نہ تو حقیقت کے خلاف ہے اور نہ مبالغہ کہ طلبہ کے اوقات فرصت کے مشاغل سے کما حقہ واقفیت رکھنے والے مدرسین کی تعداد اتنی قلیل تر ہے کہ اگر انگلیوں پر بھی گنی جا سکے تو بسا غنیمت سمجھنا چاہیے اس ترک فرض اور عدم دلچسپی کے اسباب یوں تو متعدد ہیں مگر اشد و اہم یہ ہیں کہ اساتذہ اپنے فرائض کا تعلق دس بجے سے چار بجے تک سمجھے ہوئے ہیں۔ اور یہ ذہنیت اتنی عام ہے کہ اس کے برعکس عمل کرنے والوں کے افعال اُن پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے چنانچہ جن ثانوی مدارس میں چار بجے کے بعد اساتذہ اور طلبہ کے اشتراک عمل کے چند عام مشغلے دکھائی دیتے

ہیں ان کی کھلی حقیقت یہ ہے کہ فی صد صرف چند طلبہ اور دو چار مدرسین عموماً حصہ لیا کرتے ہیں جو کچھ نہ ہونے سے تو بدرجہا بہتر ہے مگر دریا میں قطروں کا تناسب جس قدر حقیر اور ان کا اثر جیسا کچھ بے نتیجہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ معدودے چند طلبہ اور اساتذہ جو حصہ لیا کرتے ہیں وہ محض ان کے ذاتی شوق اور لگاؤ کا تقاضہ ہوتا ہے ورنہ یہ خصوصیت مبدل بہ عمومیت لازماً ہوتی۔ اس ضمن میں یہ واقعہ بھی کچھ کم غور و فکر کا محتاج نہیں ہے کہ جو مدرسین ان مشغلوں سے کنارہ کش ہیں ان کا تو ذکر ہی عبث ہے خود ان میں سرگرم حصہ لینے والوں کی ذہنیت کا یہ حال ہے کہ ہوم ورک میں کوتاہی یا تدریس میں غفلت کرنے والے طلبہ کو طعنہ دیا کرتے ہیں کہ تم کو کھیل کے مشغلوں میں جو انہاک اور دلچسپی ہے اس کا عشر عشیر بھی تعلیم میں ہوتا تو نہیں معلوم کہ اب تک کیا سے کیا ہو گئے ہوتے۔ بعض تو اسی پر اکتفا نہ کر کے دست درازی بھی کر بیٹھتے ہیں۔ اس ذکر خیر سے یہ مقصود ہے کہ جو اساتذہ طلبہ کے اوقات فرصت کو دلچسپ و فائدہ مند بنانے میں عملاً شریک ہیں خود ان کا طرز عمل ایسا ہے کہ جس سے اوقات فرصت کی قدر و قیمت و اہمیت گھٹ جاتی ہے اور اس سے صاف طور پر یہ مترشح ہوتا ہے کہ میدانی مشغلوں میں اساتذہ کی شرکت اوقات فرصت کی نگرانی وغیرہ سے زیادہ کہیں اپنے شوق کو پورا کرنے کے لئے ہوا کرتی ہے۔

اگرچہ اضلاع و تعلقات کے تمدنی و معاشرتی حالات اس قدر بدل گئے ہیں کہ ان میں خاصی شہریت رونما ہونے لگی ہے۔ بریں ہم بلدے کے مقابلے میں ابھی بہت پیچھے ہیں۔ یہاں کا ماحول اور اس کے اثرات وہاں پیدا نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بلدے اور اضلاع کے طلبہ کے مجموعی حالات میں بڑا فرق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں کے مدارس میں جب کبھی ضلع وغیرہ کا کوئی طالب علم شریک ہوتا ہے تو اس کے خیالات و عادات وغیرہ میں نسبتاً اتنا بیّن فرق دکھائی دیتا ہے کہ اساتذہ تو اساتذہ طلبہ تک بے تکلف محسوس

کرنے لگتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت خود بخود مستنبط ہوتی ہے کہ بلدے کے طلبہ کی فرصت کے اوقات بہت زیادہ فوری توجہ کے محتاج ہیں اگر ان کی طرف چندے غفلت برتی گئی تو عجب نہیں کہ آئندہ انسداد میں غیر معمولی توجہ کے باوجود بھی بیجا زحمتوں سے دوچار ہوکر تعلیم و تربیت کی ان برکتوں سے محروم ہوجانا پڑے جن کی خوش آئند توقعات کی بنا پر فی الحال معلم و متعلم سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

اس امر کے ثبوت میں کہ مدارس میں طلبہ کے اوقات فرصت کی کافی نگرانی کا انتظام نہیں ہے چند ایسے واقعات کا اظہار کیا جاتا ہے جو سنجیدہ تفتیش وتفحص کے مبنی بر حقیقت نتائج ہیں۔

جب کبھی بلدے میں میلے۔ جاترا۔ عرس۔ دنگل اور نامناسب حال محافل وتقاریب منعقد ہوا کرتی ہیں یا غیر معمولی کھیل تماشے مثلاً سرکس، کارنوال وغیرہ آیا کرتے ہیں تو اس زمانہ میں مدرسہ کی اوسط حاضری میں نمایاں کمی کے قطع نظر اوقات فرصت کے جمگھٹوں مثلاً بازی کے میدان۔ سیر و تفریح کے باغ وچمن اور ریڈیو کے مرکزوں میں کمی تعداد کے سبب جو بے رونقی اور اداسی پائی جاتی ہے۔ وہ زبان حال سے بلا خوف تردید اپنی نوحہ خوانی آپ کرتی ہے کہ طلبہ کی غیر حاضری نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ کے علاوہ ان کے اوقات فرصت کے صریح غیر مربوط ہونے کی ایسی روشن دلیل بھی ہے کہ اس پر انکار و تاریکی کا پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔

سینما کا وجود طلبہ کے لئے جتنا فائدہ بخش ہے اس سے کہیں زیادہ نقصان رساں بھی ہے۔ نقصان دہ اس لئے کہ فلموں کی زیادہ تعداد طلبہ کے نامناسب حال ہوتی ہے۔ اور کوئی طالب علم کسی فلم کو دیکھنے سے پہلے اس بات پر ہرگز غور نہیں کرتا کہ اسے اس فلم کو دیکھنا چاہیئے یا کیا نیز اس کے اوقات فرصت اس کو اس بات کی اجازت بھی دیتے ہیں یا نہیں۔ طلبہ میں سینما بینی کی وبا اس قدر پھیل گئی ہے کہ چھوٹی جماعتوں کے کمسن بچے تک اس کے دلدادہ نظر آتے ہیں

ایک اور خرابی یہ رونما ہے کہ والدین یا رشتہ دار جب کبھی فلم کو اپنے مذاق کے مطابق جان کر دیکھنے جاتے ہیں تو اپنے ساتھ اپنے ان بچوں کو بھی لے جاتے ہیں جن کو اس نامناسب مال سینما کے دیکھنے سے فائدہ تو کچھ نہیں۔ بلکہ سخت نقصان ہوتا ہے اتوار کی دوپہر میں جب کہ عموماً سینما کے فلم کم شرح پر بتائے جاتے ہیں۔ مدارس میں طلبہ کی حاضری نسبتاً کم ہوا کرتی ہے۔ طلبہ کے اوقات کا رجب اس بری طرح متاثر ہو جایا کرتے ہیں تو اوقات فرصت کی بربادی عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔

عموماً طلبہ کو شنبہ کے دن جو ہوم ورک دیا جاتا ہے۔ اس کی مقدار کسی قدر زیادہ بھی ہوتی ہے۔ اور اہمیت بھی رکھتی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ جمعہ تعطیل کا دن واقع ہونے سے اساتذہ کا خیال یہ ہوتا ہے کہ مدرسہ میں پانچ گھنٹوں کے لئے حاضر نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ کو گھر پر زیادہ کام کرنا چاہیے۔ تاحقیقت اس کے برخلاف ہے۔ چنانچہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہفتہ کا ہوم ورک باوجود جمعہ کی تعطیل کے ناعہ اور ناقص ہوا کرتا ہے۔ جس سے یہی ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ طلبہ اپنی فرصت کا اچھا استعمال نہیں کرتے اور چونکہ اوقات فرصت کا کوئی مقررہ مشغلہ اور مصرف ان کے پاس نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر تھوڑی سی کشش پر مائل ہو کر اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیا کرتے ہیں۔

چار بجے کے بعد ہوٹلوں اور چائے خانوں میں روزانہ کثرت سے طلبہ کی آمد و رفت ہوا کرتی ہے۔ اگر چائے نوشی کی ضرورت بھی تسلیم کر لی جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس کے لئے دس پندرہ منٹ کافی سے زیادہ ہیں۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ گھنٹوں اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ یا تو مہمل گفتگو میں مصروف رہتے ہیں۔ یا گراموفون کے نغموں کو انہماک سے سنا کرتے ہیں۔ بہر نوع یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مدرسہ بر خاست ہونے کے بعد ان کے لئے کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح دفع الوقتی کرنی چاہتے ہیں۔ اگر کسی طالب علم کے اوقات فرصت کا یہ مصرف ہو تو اس کی آئندہ زندگی جو اہم فرائض و افکار سے پر ہوگی اور یقیناً ہوگی کیونکر سکون و چین سے بسر ہو سکتی ہے۔

اور اس کو ایک اچھا شہری بنا سکتی ہے۔

جب طالب علم اپنے وظیفہ کی رقم حاصل کرتے ہیں۔ یا ان کے سرپرستوں کو تنخواہ ملتی ہے تو اس کے بعد دو چار روز تک ان کا رنگ ہی کچھ اور ہوا کرتا ہے۔ ان میں بعض تو غیر حاضر ہوجایا کرتے ہیں۔ اور جو مدرسہ آتے ہیں وہ ہوم ورک کی طرف سے بڑی غفلت برتتے ہیں جس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ نقدی ہاتھ لگ جانے کے بعد ان کے اوقات فرصت معمول سے کہیں زیادہ طویل اور دلچسپ بھی ہوجاتے ہیں جس کا نتیجہ یا تو مدرسہ کی غیر حاضری یا ہوم ورک کو ناغہ کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اوقات کار کی طرح اوقات فرصت کی بھی کوئی بندش ہوتی تو یہ تجاوز اور جولانی نہ پائی جاتی۔

اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب راستہ پر کوئی تماشا اور گانا بجانا ہوتا ہے۔ یا کسی حادثہ کے سبب لوگوں کا ہجوم ہوجاتا ہے تو مدرسہ کو جانے یا مدرسہ سے واپس ہونے والے طلبہ نہایت بے فکری کے ساتھ مصروف نظارہ رہا کرتے ہیں حالانکہ روانگی اور واپسی کے دونوں وقت نہایت قیمتی ہوتے ہیں۔ مگر وقت کے قیمتی ہونے کا احساس کم بلکہ بہت کم ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو طلبہ اپنی فرصت کے اوقات کی نگہداشت اور عملاً قدر نہیں کرتے ان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ اپنے اوقات کار کو بے جا صرف نہیں کریں گے سراسر عبث ہے۔

عام طور پر طلبہ میں اوقات فرصت کے قیمتی ہونے کا احساس جو کم پایا جاتا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں جو بالراست طلبہ کی ذات سے متعلق ہیں مثلاً طلبہ کی فیشن پرستی اور یہ مرض اس قدر عام اور کہنہ ہوگیا ہے کہ انسداد مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عزیز وقت کا ضرورت سے زیادہ زائد قیمتی حصہ فیشن پرستی اور اس کے اہتمام کی نذر ہوجایا کرتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کی زندگی میں سادگی روز بروز کم اور رنگینی بڑھتی جارہی ہے۔ اور اس نمود و نمایش میں فائدے سے کہیں زیادہ نقصان مضمر کیا بلکہ اظہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی

شخص اس ظاہرہ ٹیم ٹام اور صفائی کو دیکھ کر یہ خیال کرے کہ اس کی بدولت کم از کم صاف و پاک رہنے کی عادت تو پڑ جاتی ہے۔ مگر یہ خیال بھی بجائے خود درست نہیں ہے چنانچہ ان فیشن زدہ طلبہ کے پالش کئے ہوئے شوز کی جلا میں تو آئینہ کی صورت نظر آتی ہے۔ مگر جب بوٹ سے پاؤں باہر نکلتا ہے تو پاتابوں کی عفونت سانس لینے کی اجازت نہیں دیتی اسی طرح شیروانی اور پائجامہ تو ہر وقت سرخ و سفید رہا کرتے ہیں مگر بنیائن تو شائد ہفتہ میں ایک ہی وقت بدلی جاتی ہو۔ حالانکہ طہارت وصفائی کے مدنظر روزانہ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ زرق برق پوشاک پہننے والے مجبوراً نماز پڑھنے کی ضرورت کو بھی اس اظہار حقیقت سے ٹال دیا کرتے ہیں کہ پائجامہ پاک نہیں ہے۔ حالانکہ دوسرے نماز پڑھنے والوں کے پائجامے سے ان کا پائجامہ نہایت صاف اور سفید ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک اپ ٹوڈیٹ دوافتاً تشریف لائے ہیں جہاں ان کو اپنی بنیان اتارنی پڑی تو معلوم ہوا کہ بغل کے بال خاصے بڑے ہیں۔ حالانکہ ان ہی کا چہرہ صاف کہہ رہا تھا کہ روزانہ نہیں تو کم از کم ایک دن آخر ضروری اصلاح بنائی جاتی ہے۔ ایک دفعہ یہ حقیقت بھی دیکھنے میں آئی کہ جن کو کل صبح سالانہ امتحان میں شریک ہونا ہے۔ آج وہ گھنٹوں اپنے کپڑے کے اہتمام میں مصروف ہیں۔ اس بلائے بے درماں سے طلبہ کو محفوظ رکھنے کی صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اساتذہ خود اپنی سادگی اور حسب موقع فیشن کی خرابی سے طلبہ کو متنبہ کرتے رہیں اور دوسری تدبیر یہ ہے کہ والدین کو متوجہ کرکے رنگینیوں میں سادگی پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں تاکہ طلبہ اپنی قیمتی وقت کی بھینٹ اس بت کا فریہ چڑھا کر ناقابل تلافی خسارے میں نہ رہیں۔

عموماً طلبہ کے دوست طلبہ کے علاوہ چند خوش باش بھی ہوا کرتے ہیں جن کی صحبت میں طلبہ اپنا قیمتی وقت گزارا کرتے ہیں۔ ایک طالب علم اور ایک

خوش باش کی زندگی میں اس قدر نمایاں فرق ہوتا ہے کہ ان میں کوئی باہمی مناسبت ہی نہیں پائی جاتی۔ بہ الفاظ دیگر طالب علمانہ زندگی حزم واحتیاط اور پابندیوں سے اس قدر پُر ہوا کرتی ہے کہ ذرا سی لغزش بھی کسی طالب علم کو جادۂ علم سے متحرک کرکے اس کی موجودہ و آئندہ زندگی کو کچھ نہیں تو کم از کم دشوار گزار کرسکتی ہے۔ برخلاف اس کے خوش باشانہ زندگی کا کوئی ایسا مستقبل عموماً نہیں ہوا کرتا جس کو زمانہ حال کی ہر ایک لغزش تاریک کرسکے اور تاریک کردینے بھی تو تلافی مافات کی کئی نعم البدل صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں لیکن طالب علم کی کوئی غلطی اس کو آئندہ کے نقصان سے نہیں بچا سکتی اور بچا بھی کیسے سکتی ہے۔ جبکہ بچپن کی چوٹیں پیری میں لازماً رنگ لایا کرتی ہیں۔ اعتدال کی روشیں بہت ہی شاذ دیکھی جاتی ہیں۔ اعتدال پیدا ہو ہی کیسے سکتا ہے جبکہ دونوں کے حالات۔ خیالات۔ فرائض اور مطمح نظر وغیرہ بالکل مختلف ہوا کرتے ہیں۔ چونکہ طلبہ کے مشاغل عموماً خشک اور سیدھے سادے ہوتے ہیں اور ان میں جاذبیت بھی کم ہوتی ہے۔ اس لئے وہ خوش باشی کے مشغلوں پر اثر انداز ہونے کی بجائے خود نہایت آسانی سے رنگینیوں کا نت نیا شکار ہوجایا کرتے ہیں۔ جو طلبہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکے اور پہنچے بھی تو ان کی طالب علمی کا زمانہ کچھ ممتاز و درخشاں نہیں رہا۔ اگر ان کے اسباب وعلل دریافت کئے جائیں تو یقین ہے کہ اُن کی بربادی ونامرادی کا ایک لازمی سبب یہ ہی ہوگا کہ ان کو خوش باشوں سے صحبت رہا کرتی تھی۔ جس طرح کسی ہونہار درخت کو قریب اطراف کے خودرو پودے اندر ہی اندر کمزور اور خراب کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح طالب علموں کو خوش باشوں کی صحبت گھن کے مانند کھائے جاتی ہے جس کے زہریلے اثرات سے طلبہ کو بچانا والدین اور اساتذہ کا یکساں فرض ہے اور بچاؤ کی سب سے پہلی صورت یہ ہے کہ طلبہ کی فرصت کے مشاغل کافی اور ایسے دلچسپ بھی ہوں کہ ان کی طرف سے اعراض و اغماض ناممکن نہ بھی ہو تو دشوار ضرور ہو۔ ظاہر ہے کہ جس گھر میں دلچسپی اور انس ومحبت نیز راحت و آرام کے

سامان موجود ہوتے ہیں۔ کوئی شخص ان کو ٹھکرا کر ہوٹلوں اور مسافر خانوں کی ہوا کھانا قطعاً گوارا نہیں کر سکتا اور اگر بالفرض محال کبھی ایسا ہو بھی جائے تو تا بہ کئے۔ آخر اس کو جلد یا بدیر اپنے اصل مرکز پر لوٹ کر آنا ہی پڑے گا۔ اور یہ آنا ایسا آنا ہوگا کہ پھر جانے کا نام تک نہ لیگا۔

ایک اور خرابی طلبہ کے مزاج میں یہ پائی جاتی ہے کہ ان کے اکثر کاموں میں اعتدال و توازن نہیں ہوتا۔ جدھر ڈھل گئے بس ادھر کے ہو رہے اور یہ کیفیت اس زمانے میں زیادہ تر طاری و ساری رہتی ہے اور عام طور پر محسوس بھی ہونے لگتی ہے جب مکان یا مدرسہ میں کوئی غیر معمولی تقریب واقع ہوتی ہے اور اس کے سرانجام میں یہ خود بھی ہاتھ بٹایا کرتے ہیں تو اس موقع پر روزانہ کے معمولی و شدنی فرائض کو اس طرح فراموش کر جاتے ہیں۔ کہ گویا کبھی ان سے واسطہ ہی نہ پڑا تھا۔ طرہ یہ کہ اصل فرائض کو یک سخت اور بُری طرح فراموش کر جانے والے طلبہ کو غیر معمولی فرائض کی دیوانہ وار انجام دہی پر ہماری طرف سے شاباش اور انعام بھی ملا کرتا ہے۔ جو اعتدال کی مسلمہ برکتوں کو اُن کی نظروں سے فی الحال اوجھل کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ افراط و تفریط کے مجرم ہونے کے باوجود اپنے جرم پر فخر و مسرت بھی کرتے ہیں۔ بہت دن ہوئے کہ دار الاقامہ میں رہنے والے ایک طالب علم کو ان کے استاد نے طبعی جغرافیہ کے سبق سے متعلق نظام شمسی کا نقشہ کھینچ لانے کے لئے کہا تھا۔ اور شاید بہترین نقشہ پر انعام کا لالچ بھی دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علم جمعہ کا پورا دن اور بڑی رات تک صرف اسی ایک کام میں لگا رہا اور ہفتہ کی صبح میں مدرسہ جانے تک کچھ نہ کچھ گلکاری کرتا ہی رہا۔ جب مدرسہ سے واپس ہوا تو بہت فرحاں و شاداں تھا اور اور اپنا نقشہ دیکھا کر ایک ایک سے کہتا تھا کہ میں نے انعام پایا ہے۔ حالانکہ اسی طالب علم نے دوسرے مضامین کے ہوم ورک ناغہ اور برآئندہ کر دیا تھا۔ مگر اس نادان کو اس حقیقت کا احساس کہاں تھا کہ اس کی مصروفیت میں بے اعتدالی امرت میں زہر کی آمیزش کا اثر رکھتی ہے۔ نظر بر آں اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ طلبہ کے مزاج میں جس طرح ہو سکے۔ اعتدال پیدا کیا جائے۔ جس کی آسان مثال

تدبیر یہ ہے کہ مضمون نگاری اور تقاریر و گفتگو میں مبالغہ آمیز خیالات کی بروقت اصلاح ہوتی رہے اور غیر معتدل کاموں کی جن کے نتائج بظاہر کتنے ہی دل خوش کن کیوں نہ ہوں۔ تعریف و ستائش کی بجائے ہمیشہ مذمت کی جائے۔

جس طرح روپے سے بہت سے نیک کام سرانجام پاتے ہیں اسی طرح اس سے اکثر و بیشتر برائیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ زہر بذات خود اتنا برا نہیں ہوتا جتنا کہ اس کا بے جا مصرف اس کو برا کر دیتا ہے۔ اور مصرف کے نقطہ نظر سے اگر کمانے والا ایک اور خرچ کرنے والا دوسرا ہو تو اکثر اس کے استعمال میں پرلے درجہ کی بے دردی پائی جاتی ہے۔ بلکہ موجب نقصان نتائج بھی برآمد ہوا کرتے ہیں۔ یہی حال طلبہ کی آمدنی اور اس کے خرچ کا ہے۔ طلبہ کے ہاتھ میں نقدی شیر خوار بچوں کے ہاتھ میں تیز ہتھیار کے مرادف ہے جس کو وہ دل خوش کن کھلونا سمجھ کر کھیلتے کھیلتے خود ہی زخمی ہو جاتے ہیں اور دوسرے ہم سنوں کو بھی مجروح کر دیتے ہیں۔ اور باوجود اس کے معصوم کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ طلبہ اپنی آمدنی بجا طور پر صرف نہیں کرتے اور جس زمانے میں ان کے پاس کچھ ہوتا ہے تضیع اوقات کے نت نئے شغلے رہ رہ کر پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔ کمسن بچوں کی حد تک تو خیر والدین سے کہہ کر نقدی کی بجائے ضرورت کی چیزیں فراہم کرا دی جا سکتی ہیں۔ مگر بڑی عمر کے طلبہ نقدی سے بالکلیہ محروم نہیں کئے جا سکتے۔ البتہ ترغیب و تشویق کے ذریعہ انہیں سیونگ بنک کا رکن بنایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد استحکام کی مناسب صورتیں بھی اختیار کی جا سکتی ہیں مثلاً۔ یہ کہا جائے کہ جو طالب علم سال بھر میں زیادہ سے زیادہ رقم جمع اور کم سے کم خرچ کرے گا۔ اُسے معقول انعام دیا جائے گا جن پر مدرسہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ یقین ہے کہ اس طریقہ عمل سے طلبہ میں نہ صرف کفایت شعاری کی مبارک عادت پڑ جائے گی۔ بلکہ نقدی کے سبب تضیع اوقات کے مواقع کا انسداد بھی بڑی حد تک ہو جائے گا۔

عموماً اوسط درجے اور خصوصاً اونچے طبقے کے طلبہ اپنی روزمرہ کی معمولی

ضروریات کو دوسروں کے ذریعہ سرانجام دلانے کے عادی ہوا کرتے ہیں جس کے سبب ان کے اوقات فرصت کی مصروفیت میں بہت نہیں تو تھوڑی کمی ضرور ہوجایا کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بڑی جماعت کا ایک طالب علم جس کا مکان بھی مدرسہ سے بہت قریب تھا۔ اپنی چند کاپیاں اور کتابیں لانے کے لئے نوکر کو ہمیشہ مدرسہ لایا کرتا تھا۔ اگر یہ طرز عمل اظہار شان کے لئے بھی ہو تو طالب علم کے لئے یقیناً نازیبا ہے۔ ایسے طلبہ سے جو اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں ملازمین کے محتاج ہوتے ہیں مدرسہ کے اوقات وغیرہ اوقات میں بھی غیر درسی کام زیادہ لینا چاہیے۔ تاکہ وہ نہ صرف کام کرنے کے عادی ہوجائیں۔ بلکہ کسی کام کے سرانجام کو خلاف شان نہ تصور کریں۔ علاوہ ازیں "اپنے روزنامچے" کے عنوان پر مضمون لکھوا کر اس امر کا پتہ لگانے کے بعد کہ طالب علم کے مضمون میں اپنی ضروریات آپ پوری کرنی مذکور نہیں ہے تو موثر پیرایہ میں پند ونصیحت کی جاسکتی ہے کہ ملازمین کے موجود ہوتے پر بھی طالب علم کو اپنی ہر ضرورت آپ پوری کرنی چاہیئے۔ اور اس میں اس کی ذلت نہیں بلکہ عین عزت ہے۔ نیز اگر موقع مل جائے اور مناسب بھی سمجھا جائے تو والدین کو بھی اس خصوص میں توجہ دلائی جاسکتی ہے۔

جو لوگ علی الصباح بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ وہ اس امر حقیقت کی گواہی دے سکتے ہیں کہ سحر خیزی کی بدولت خصوصاً نوجوانوں میں ایسی تازگی لازماً پیدا ہوجاتی ہے۔ جو ان کو کاروبار میں لطف وبشاشت کے ساتھ دن بھر مصروف رکھتی ہے۔ چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ اگر کسی روز دن چڑھے بیدار ہونے کا اتفاق ہوتا ہے تو طبیعت میں اکثر سستی پیدا ہوکر کام کاج کے بیشتر اوقات بے کاری کی نذر ہوجایا کرتے ہیں۔ دیر سے بیدار ہونے کی عادت زیادہ تر مسلمان طلبہ میں پائی جاتی ہے اور اس کو رفع کرنے کی جہاں بہت ساری تدبیریں ہیں وہاں ہم خرما وہم ثواب ایک تدبیر یہ ہے کہ بالغ مسلم طلبہ کو صبح کی نماز اپنے محلہ کی مسجد میں باجماعت ادا کرنے کی نہ صرف تاکید کی جائے بلکہ طلبہ ہی میں سے کسی ایک موزوں طالب علم کو نگران کار مقرر کرکے

چند روز تک اس سے حاضری کی رپورٹ بھی لی جایا کرے۔ عموماً ہر مدرسہ میں انجمن طلبہ ہوا کرتی ہے۔ اس کے جلسے بعد برخاست مدرسہ منعقد کرنے کی بجائے کسی تعطیل کے دن علی الصباح مقرر کئے جائیں۔ جب کبھی طلبہ تعلیمی تفریح کے لئے جایا کریں۔ تو روانگی کا وقت طلوع آفتاب سے قبل مقرر کیا جائے۔ موسم گرما میں عام طور پر جب کہ مدارس صباحی ہوا کرتے ہیں۔ طلبہ کی دیررسی کی سختی کے ساتھ نگرانی کرنی چاہیئے۔

تضیع اوقات نہیں تو کم از کم خلل اوقات کے اسباب میں ایک سبب طلبہ کی شاعری اور ناول و سینما بینی وغیرہ بھی ہے۔ آورد کا تو ذکر ہی کیا۔ آمد کے لحاظ سے بھی شاعری طلبہ کے لیے غیر سودمند بلکہ مضرت رسان مشغلہ ہے۔ شاعری بجائے خود ایک مستقل فن ہے۔ جس کو حاصل کرنا مشکل ہے۔ تک بندی کو شاعری سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہونا بڑی سخت غلطی ہے۔ جو طلبہ شاعری کے گورکھ دھندے میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنا بہت سا قیمتی وقت اس کی نذر کرنے کے بعد بھی کچھ حاصل نہیں کر سکتے چنانچہ اساتذہ کی سالانہ کانفرنس کے مشاعرہ کا اشتہار تختۂ اعلان پر چسپاں دیکھ کر ششم جماعت کے ایک طالب علم نے کئی روز کی مسلسل کوشش کے بعد چند اشعار لکھے تھے جو غیر موزوں بے ربط اور مہمل تھے۔ اگر اساتذہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں طالب علم کو شاعری کا خبط ہے تو ان کا فرض اولین یہ ہے کہ اس بے سود مشغلہ سے اس کو باز رکھنے کی ممکنہ کوشش کریں اور بخوبی سمجھا دیں کہ دندان توجملہ در دہانند کا نام شاعری نہیں بلکہ صریح تضیع اوقات ہے۔ ظاہر ہے کہ جو طلبہ سیدھی سادی نظم کو بھی استاد کی تفہیم کے بغیر نہیں سمجھ سکتے وہ قاعدہ و قانون سے پُر شاعری کیونکر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ناول بینی کا چسکا خلل و تضیع اوقات کا موجب ہوتا ہے۔ نیز اس سے اخلاق خراب اور مزاج میں سادگی کی بجائے رنگینی پیدا ہوتی ہے۔ جو طلبہ کے لیے سراسر نازیبا ہے۔ مدرسہ کے کتب خانے اور دارالمطالعہ میں پہلے تو اس قسم کا مواد نہ ہونا چاہیئے۔ اور اگر کہیں ہو بھی تو اس سے طلبہ کو باز رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ان سب سے بڑھ کر سینما بینی کا شوق طلبہ کے نہ صرف اوقات فرصت بلکہ

اوقات کار کو بھی بری طرح متاثر کر رہا ہے۔ اس کی دست برد سے طلبہ کو محفوظ رکھنے کی ایک حکمۂ صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اعلان کے ذریعہ طلبہ تنبیہ کر دیئے جائیں کہ جنک مدرسہ کی طرف سے کسی موزوں د سفید فلم کے دیکھنے کی سفارش نہ کیجائے کوئی طالبعلم از خود فلم ہرگز نہ دیکھے؛ بصورت خلاف ورزی اس طالبعلم کا نام نہ صرف خارج کر دیا جائیگا بلکہ ترک مدرسہ کے داخلہ پر اسکی یہ عدول حکمی نوٹ بھی کردیجائے گی جو دوسری سرکاری مدرسہ میں شریک ہونے سے روک سکے گی اسی پر اکتفا نہ کر کے کنشا فوں اور دوسرے طلبہ کے ذریعہ نگرانی کا مناسب انتظام کرنا بھی خلاف ضرورت نہ ہوگا۔ بایں ہمہ اگر کسی طالب علم کی خلاف ورزی ثابت ہوجائے تو حسب اعلان اس کا نام خارج کرنے میں ہرگز پس و پیش نہ کرنا چاہیئے مزید برآں سررشتہ کو توجہ دلا کر قانونی صورت میں اس سے زیادہ مستحکم انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔

مناسب ہوگا کہ ہر ایک طالب علم بہ علم صدر مدرس اپنے اوقات فرصت کا نظام العمل مرتب کر کے اس کی نقل پیش کرے جس میں حسب ضرورت مناسب اصلاح کرنے کے بعد اس پر عمل کرنے کے فوائد سے واقف کیا جائے۔ اس تدبیر کو کارگر کرنے کے لئے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اوقات فرصت کا ترمیم شدہ نظام العمل منفرد طور پر افتاد مزاج کے لحاظ سے ایسا موزوں و دلچسپ او مشاغل میں تازگی پیدا کرنے والا ہو کہ طالب علم اس سے انحراف نہ کرسکے اور اس کی بے کم و کاست پابندی کرانے میں کسی نگرانی کی ضرورت نہ ہو۔ اگرچہ کہ یہ کام بظاہر کسی قدر مشکل معلوم ہوتا ہے مگر طالب علم کے مزاج کو بخوبی سمجھ لینے کے بعد خود بخود آسان ہو جائے گا۔

ہوم ورک کے جواز و عدم جواز کا سوال ایک جداگانہ مسئلہ ہے جس سے بحث کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ البتہ بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ طلبہ کے اوقات فرصت سے ہوم ورک کو گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا کافی دلچسپ ہونا ضروری ہے۔ اور جس ہوم ورک میں دلچسپی نہ ہوگی اس سے طلبہ کے اوقات کی نگہداشت قطعاً ناممکن ہے۔ مثلاً خوشخطی کا ہوم ورک اتنا دلچسپ نہیں ہوتا جتنا مضمون نویسی کا ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی بہت ممکن ہے کہ ہوم ورک کا مضمون

دلچسپ ہونے کے باوجود اس کی مقدار اس کو غیر دلچسپ بنا دے اس لئے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہوم ورک زیادہ دلچسپ ہو۔ اکثر مدارس میں ہوم ورک کا کوئی نظام العمل مرتب و آویزاں نہیں ہوتا جس کے سبب غیر ضروری مضامین میں بھی طلبہ کو ہوم ورک کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ ایک جماعت کے کئی مضامین متعدد اساتذہ کے تفویض ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر ایک اُستاد اس علم کے بغیر کہ طلبہ کو دوسری مضامین میں کتنا ہوم ورک کرنا ہے۔ اپنے متعلقہ مضمون کا ہوم ورک دیدیا کرتا ہے۔ جو طلبہ کے لئے یقیناً بار خاطر ہوتا ہے۔ جس کا ثبوت وہ عموماً ہوم ورک ناغہ کرکے دیا کرتے ہیں اور بعض تو محض ہوم ورک کے سبب مدرسہ سے غائب بھی ہوجاتے ہیں۔ جس طرح تعلیم کا اوقات نامہ مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح ہوم ورک کا نظام العمل بھی لازماً مرتب ہونا چاہیئے نصاب تعلیم میں مضامین کی بہتات ہونے کے باوجود طلبہ کو کسی دن بھی تین مضامین سے زائد ہوم ورک کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ اور اگر ممکن ہو سکے تو ہفتہ میں ایک دن ہوم ورک کے لئے تعطیل کا بھی ہونا چاہیئے نیز اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ ہوم ورک کی زیادہ مقدار ہمیشہ مضر اور کم مقدار منفعت بخش ہوتی ہے۔

طلبہ کے اوقات فرصت کا بہتر مصرف اور اس کی قابل اطمینان نگہداشت جیسی مدرسہ میں ہوسکتی ہے۔ کسی دوسری جگہ ممکن نہیں۔ جب یہ حقیقت حال ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ دس سے چار بجے تک تو مدرسہ مدرسہ رہے اور اس کے بعد کلب بن جائے۔ اس کے لئے سرمایہ اور ساز و سامان کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ صرف اساتذہ کی عملی ہمدردی بہر نوع درکار ہے اگر کوئی مدرسہ میدانی کھیلوں کا انتظام نہیں کرسکتا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مکانی کھیلوں میں تو بہ ظاہر کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ کچھ نہ سہی بھی تو ہر جماعت کے لئے اسی کا کمرہ ورزش کی چار دیواری کا کام بہ آسانی دے سکتا ہے۔ اگر خود استاد صاحب بھی شریک ہوجائیں تو سونے میں سہاگا ہو جائے۔ اوقات فرصت میں باغبانی کا مشغلہ بھی کچھ

کم دلچسپ اور منفعت بخش نہیں ہے اگر یہ اندیشہ ہو کہ روزانہ کی مصروفیت طلبہ کی دلچسپی کو رفتہ رفتہ کم کر دے گی اور وہ اس سے جی چرانا شروع کر دیں گے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ جن طلبہ کو اس مشغلہ سے لگاؤ ہو اُن ہی کو اس میں لگایا جائے۔ تاکہ ان کا فطری شوق کم ہونے کی بجائے روز بروز ترقی کرتا جائے۔ جن مدارس میں ریڈیو کا انتظام ہو سکتا ہے۔ وہاں اس کے ذریعہ طلبہ کے اوقات فرصت میں مزید دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے مگر اس کا مناسب حال استعمال نہایت سختی کے ساتھ محدود ہونا چاہیئے تاکہ ان کی سادہ زندگی میں رنگینی کے زہریلے اثرات شریک ہونے پائیں

ہر مدرسہ میں خواہ وہ کسی درجے کا کیوں نہ ہو۔ عجائب خانہ قائم کیا جا سکتا ہے جس کے لئے ایک مختصر حجرہ بھی کافی ہے۔ اس میں عمر کے لحاظ سے چند شعبہ جات قائم کیے جائیں۔ مثلاً ۸ سے ۱۲ اور ۱۳ سے ۱۷ سال وغیرہ اور ہر ایک طالب علم کے لئے لازمی قرار دیا جائے کہ مہینے میں ایک یا دو چیزیں جو زیادہ تر اس کے اوقات فرصت کی مصروفیت کے حقیقی نتائج ہوں داخل کرے۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی اور ازدیاد شوق کے لیے مدرسہ کی جانب سے انعامات بھی ضرور ملتے جائیں۔ انعامات کی فراہمی میں طلبہ کے سرپرستوں سے بھی مالی امداد لی جا سکتی ہے۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے۔ جس کی فی زمانہ شدید ضرورت ہے۔ قسم قسم کی دستکاریوں کا علم و مہارت فال نیک کا موجب ہو گی۔ ممکن ہے کہ فی الحال قلیل آمدنی کا ذریعہ بھی ہو جائے۔ اس میں خود مدرسہ کو بھی ایک بڑا فائدہ یہ حاصل ہو گا کہ نمائش میں مدرسہ کی طرف سے بروقت اچھا سامان بھیجنے میں سہولت پیدا ہو جائے گی اور نتائج بھی یقیناً اچھے رہیں گے۔ اگر اس تدبیر اور انتظام سے معدودے چند طلبہ کے اوقات فرصت کا قلیل ترعرصہ بھی ضائع ہونے سے بچ جائے تو اس کے مفید و ضروری ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔

طلبہ کے اوقات فرصت کی نگرانی کے مدنظر اگر یہ انتظام سررشتہ کی طرف سے ممکن ہو سکے کہ جن محلوں سے طلبہ مدرسہ آتے ہوں۔ اسی مدرسہ کا کوئی

نہ کوئی اُستاد کسی نہ کسی محلہ میں رہتا تو تو طلبہ کی نگرانی بہ آسانی عمل میں آسکتی ہے اور یہ صورت چنداں مشکل نظر نہیں آتی کیونکہ مدرسین تو کہیں نہ کہیں سکونت پذیر ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی قریب کے مدرسہ پر اُن کا تبادلہ کرنا یقیناً کافی ہوگا۔ تبادلے تو ہر سال ہوتے رہتے ہیں۔ اگر اس مقصد سے بھی ہوا کریں تو غالباً خلاف ضرورت نہ سمجھے جائیں گے۔

کم از کم ہر فوقانیہ مدرسہ کے ساتھ اگر دار الاقامہ قائم ہو جائے تو طلبہ کے اوقات فرصت کی اصولی نگہداشت کی ایک قابل اطمینان صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح وسطانیہ و تحتانیہ مدارس میں تعلیم شبینہ کا مناسب انتظام بھی حصول مقصد میں ایک گونہ مفید ہو سکتا ہے۔ روشنی کا انتظام خود طلبہ اپنے ذمہ لے سکتے ہیں۔ البتہ نگرانی کے انتظام میں ہمدرد اساتذہ کو باری باری سے ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہے۔

عموماً مدارس میں کشافوں کی تعداد مدرسہ کی مجموعی تعداد سے یقیناً بہت ہی کم ہوتی ہے جس کا ایک بڑا سبب مالی مشکلات ہیں ایسی صورت میں اگر یہ مناسب ہو سکے تو بہت بہتر ہے کہ طلبہ کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو کشافہ کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ چند ضروری لوازمات سے عاری ہونے کے باوجود قابل کشافوں سے عملاً کسی طرح کم نہ ہوں۔

طلبہ کی محلہ وار فہرست مرتب کی جائے اور جب کسی مدرسہ میں یہ چند فہرستیں تیار ہو جائیں تو سن و شعور کے لحاظ سے ہر فہرست میں چند مانیٹر مقرر کیے جائیں۔ جس محلے سے تفریح کے باغ و چمن میدان اور بہبودی اطفال کے مرکز قریب ہوں۔ وہاں طلبہ کے بھیجنے کا انتظام کرنا چاہیے۔ مانیٹروں کی نگرانی کے علاوہ کبھی کبھی استادوں سے بھی نگرانی کرانی ضروری ہے اگر طلبہ کما حقہ استفادہ کرنے کی طرف راغب نہ ہوں تو ان کو مزید تشویق و ترغیب دلانی چاہیے۔ تشویق کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہر مہینہ ان طلبہ کا وزن کرایا جائے۔ اور جو وزن میں

سب سے زیادہ ترقی کرے اس کی ممکنہ طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جائے۔ اگر طلبہ کو اس کا چسکا پڑ جائے اور وہ ایک دوسرے کی ریس کرنے لگیں تو یقین ہے کہ نتائج نہایت خوش آئند ہوں گے۔

تعطیل کے دنوں میں کبھی کبھی مدرسہ میں طلبہ کے اجتماع کے مواقع ضرور پیدا کرنے چاہئیں۔ مثلاً انجمن طلبہ کے جلسوں کا انعقاد، کھیل تماشہ کا انتظام کسی خاص انعامی مضمون کا امتحان۔ دلچسپی اور افادیت کے نقطہ نظر سے تعلیمی تفریح نسبتاً اچھی مصروفیت ہے۔ کم از کم مہینے کی ایک نہ ایک تعطیل میں اس کا انتظام ضرور ہونا چاہیے۔ بڑی عمر کے طلبہ تو دور دراز بھی جا سکتے ہیں۔ اخبارات وغیرہ کی مدد سے اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ کس تعطیل میں طلبہ کے مناسب حال علمی جلسے۔ نمائشیں۔ میلے۔ جاترا۔ عرس ورزشی کرتب۔ میدانی کھیلوں کے مقابلہ وغیرہ کہاں کہاں مقرر و منعقد ہوں گے ان کی اطلاع چند ضروری ہدایات کے ساتھ تختۂ اعلان پر ایک دن قبل چسپاں ہونی چاہیے۔ اس میں مناسب اہمیت پیدا کرنے کے لیے جماعت یا مکان پر طلبہ سے مضمون لکھوانا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا تاکہ طلبہ اس میں شریک ہونے کو تعلیم کا ایک جز تصور کریں۔

طلبہ کے اوقات فرصت کی مصروفیت کے متعلق جو چند ممکن العمل تدابیر بیان کی گئی ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونے میں استاد و شاگرد دونوں کو زحمت و دقت سے دوچار ہونا نہ پڑے گا اور اگر خاص حالات کے تحت ایسی نوبت بھی آجائے تو اس مسئلہ فرصت کی ناقابل نظر انداز اہمیت کے مدنظر اس کو گوارا اور آسان کرنے میں امکانی کوشش سے ہرگز دریغ نہ کرنا چاہیے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

تلخیص روداد جلسہ ہا انجمن اساتذہ بلدہ

سنہ ۱۳۴۶ ف

مرکز مدرسہ فوقانیہ دار العلوم بلدہ | سال حال مدرسہ ہذا میں حسب ذیل جلسے ہوئے جن میں مندرجہ ذیل حضرات نے خیالات ظاہر کئے۔ مولوی محمد سعادت اللہ خاں صاحب، مولوی سید جعفر حسینی صاحب، مولوی محسن خان صاحب، مولوی عبد المجید صاحب، مولوی محمد یوسف صاحب، مولوی اقبال علی صاحب، مولوی محمد ناظم صاحب صدیقی، مولوی شمس الدین محمد عثمان صاحب مسٹر ایشور سنگھ، مسٹر گنیش چند!

"شخصی حفظ صحت"

توریث اور ماحول سے صحت متاثر ہوتی ہے معائنہ طبی ضروری ہے حفظ صحت کے نصاب میں عام تعلیم صحت اور گھر کی نسبت حفظ صحت کا بیان ہونا چاہیئے۔ طبقہ فوقانیہ میں اعضائے انسانی کی تشکیل بتانی چاہیے۔ امریکہ اور یورپ کی طرح دانت بال اور ناخن کا معائنہ کرنا چاہیے پھر اس پر روشنی ڈالی گئی کہ جماعت میں ہم عمر طالب علم ہوں غیر اشخاص کو نہ آنے دیں وغیرہ بند کمروں میں بیٹھنا سونا نامناسب ہے المونیم کے ظروف سے پرہیز کیا جائے۔

"منزل ہائے تعلیم"

مدارس تنگ و تاریک نہ ہوں آواز کا تصادم نہ ہو بیت الخلا ڈرینج کے جدید اصول پر ہوں نشستوں کے نیچے کوڑا کرکٹ نہ ہونے دیں۔ بچوں کو تاکید

کریں کہ لباس صاف رکھیں ناخن اور بال کٹوائیں عمارت مدرسہ کو تھوک سے غلیظ نہ کریں۔ پھر بیان کیا گیا کہ اصول حفظ صحت کے موافق کونسی عمارت ہوسکتی ہے اور کیسے ہونا چاہیے وغیرہ۔

"بچوں کے امراض اور ان کے انسداد کی تدابیر"

خرابی بصارت کا سبب یہ ہے کہ بچے امتحانات کے قریب مغرب کے وقت چاندنی رات میں مطالعہ کرتے ہیں۔ دوڑنے کے بعد ٹھنڈا پانی پیتے ہیں اس کی ممانعت کرنی چاہیئے۔ طلبہ کی نشست ایسی ہونی چاہیے کہ روشنی دائیں طرف سے آئے ورزش اور غذا کے بعد آرام کے لئے وقفہ چاہیے۔ سیکل کی سواری چورن بیچنے والوں کا مدرسے کے باہر آنا کھلانے پینے کی بے احتیاطی باعث امراض معدہ ہے ریچھوٹے حروف کے اخبارات سے بصارت متاثر ہوتی ہے۔ چیچک خارش وغیرہ کی بیماریاں متعدی ہیں ایسے بچوں کو صحت تک مدرسہ نہ آنے دینا چاہیئے۔ مدرسین کے اختیاری ہدایات فضا مدرسہ کی حد تک محدود ہیں۔ پھر مکان مدرسہ کی نوعیت ہوا روشنی بچوں کے فاصلے پانی کا انتظام وغیرہ کی توضیح کی گئی نماز کی پابندی کو موجب طہارت جسم بتایا گیا مدرسین کو چاہیے کہ وہ بہتر نمونہ بنیں سزائے جسمانی بچوں کے احساس خودداری اور وقار کو ضائع کر دیتے ہیں۔

"فرنیچر مدرسہ"

مدرسہ کا فرنیچر اور ساز و سامان ومناسب ہونا چاہیے بچوں کو تاکید کریں کہ فرنیچر خراب نہ کریں اور چاقو سے اس کو نہ کاٹیں۔ ردی دانوں کا صحیح استعمال چاہیے۔ ڈول ڈیسک سے طلبہ کو سہولت ہوتی ہے طلبہ سیدھے بیٹھنے کے عادی ہونا چاہیئے کیونکہ غلط طریقہ نشست سے صحت متاثر ہوتی ہے۔ تختہ سیاہ یا تو پھرنے والا ہو یا کسی قدر بڑا دیوار سے چپاں ہو مختلف رنگ کے چاک استعمال کریں پرانے فرنیچر پر پالش کرانا چاہیئے طلبہ کو انسانیت اور اخلاق کی تعلیم دینی چاہیئے۔

"دماغی صحت"

ابتدا سے بچوں کو اظہار مطالب کا موقعہ دیا جائے علم کے مقابلہ میں عملی کام زیادہ مفید ہے۔ طلبہ کو چاہیئے کہ وہ رٹنے کے بجائے سمجھ کر پڑھیں دماغی صحت کے لئے سورج کی روشنی تازہ ہوا ضروری ہے۔ بُرے کام خوف وغم کاروبار کی زیادہ مصروفیت دماغ کو کمزور کرتی ہے۔ مدرسہ کے ٹائم ٹیبل میں اہم کام کے بعد آسان مضامین رکھے جائیں۔ جز تعلیم مناسب اور عمر کے اعتبار سے ہونی چاہیئے۔ مدرسہ کے کام کے علاوہ بچوں کو خارج از نصاب دلچسپیوں میں مصروف رکھیں۔ ہوم ورک طلبہ کی استعداد کے موافق اور زیادہ نہ ہو۔ اہم اور مشکل مضمون کو آسان زود فہم بنانا مدرس کے اختیار میں ہے۔

مرکز مدرسہ فوقانیہ چنچل گوڑہ سال حال مدرسہ ہذا میں حسب ذیل جلسے ہوئے جن میں مندرجہ ذیل حضرات نے خیالات ظاہر کئے

مولوی محبوب الحسن صاحب، مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب، مولوی سید علی محمد صاحب اجلال، مولوی شیخ محبوب صاحب، مولوی ظل حسنین صاحب، مسٹر ڈنکر نارائن مسٹر راما ریڈی، مسٹر بال ریڈی۔

"ذاتی حفظ صحت"

انسان اشرف المخلوقات ہے اس لئے تکمیل مکارم اخلاق ضروری ہے۔ انسان کو انسان بنانے کے لیے اصول حفظ صحت کی پابندی مقدم ہے۔ تندرستی کے لئے صاف ہوا سادہ غذا چاہیئے فکر وغم سے دوری باعث تندرستی ہے۔ ڈرل سے صحت حاصل ہوتی ہے تندرستی میں صرف بدن کی صحت ہی نہیں بلکہ اس میں روحانی ونفسانی صحت بھی داخل ہے اس لئے حسد وبغض وغیرہ سے بچنا باعث صحت امراض روحانی ہے۔

"طلبائے مدارس کی عام بیماریاں اور اُنکے انسداد کی تدابیر"

ضعف بصر، دماغ کی کمزوری اور اختلاج قلب کے امراض کی اطلاع طلبہ کے اولیا کو دینی چاہیئے تاکہ وہ علاج کریں۔ ناصاف وناپاک ٹوکریاں بھی جنمیں میں بیچے سودا سلف لاتے ہیں بیماریوں کا سبب ہیں۔ بعض علیل اور کمزور طلبا بظاہر تندرست

مگر درحقیقت بیمار ہوتے ہیں ان کا علاج ضروری ہے ۔ طلبہ کی ڈال ڈاکٹر کی رائے سے منتخب ہونا چاہیئے جن بچوں کے قوی ڈرل کے مناسب نہیں ہیں ان کے لئے جبر و تشدد مفید نہیں ہے طلبہ کی صحت کے لئے عام صفائی کا بھی لحاظ رہے ۔ مدرس سگریٹ وغیرہ نہ پیئے تاکہ بچے ان کی تقلید نہ کریں ۔ پور فنڈ کی رقم سے معمولی امراض کی دوا مہیا رکھنی چاہیئے ۔

"مدرسہ کا فرنیچر اور اس کے متعلقات"

موجودہ فرنیچر اصول حفظ صحت کے موافق نہیں ہے اس لئے اس میں رد و بدل کی ضرورت ہے پھر اس پر تفصیلی بحث کی گئی کہ فرنیچر کیسا اور ان میں کن باتوں کا لحاظ ہونا چاہیئے تاکہ طلباء کو سہولت حاصل ہو ۔ ہر جماعت میں آلات تعلیمی محفوظ رکھنے کے فرنیچر بھی زد ۔ دیا گیا کرسی پر بیٹھ کر پڑھانے سے مدرس کی نظر پوری جماعت پر نہیں پڑتی اس لئے لکچر اسٹینڈ ہونا چاہیئے ۔ مدرس کے لئے ٹیچر روم میں آرام دہ کرسیاں ہوں ۔ دستی مشاغل ڈرائنگ اور مطالعہ قدرت مصروفیات زائد از نصاب کے لئے کافی آلات و فرنیچر کی ضرورت ہے ۔ مدارس کی تعداد میں اضافہ کرنے کے بجائے ان میں باقاعدگی اور کافی فرنیچر کی ضرورت ہے ۔

"دماغی حفظ صحت"

دماغی حفظ صحت سے مراد یہ ہے کہ انسان تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے انسان ماحول کے اثر سے اچھے یا برے عادات کا حامل بنتا ہے مدارس کی تربیت جسمانی و دماغی کے لئے ہے تاکہ نونہالان قوم مفید اور کارآمد بنیں ۔ ظاہری احساسات کی تربیت سے تبعاً و ضمناً صحت دماغی بھی حاصل ہو جاتی ہے ۔ جسمانی خرابی سے دماغی خرابی پیدا ہوتی ہے اس کے لئے مناسب غذا اور ورزش جسمانی ہے گیس دماغی خرابی کو دفع کرتے ہیں ۔ حواس خمسہ ظاہری کی تربیت حواس خمسہ باطنی کی تربیت کا باعث ہے ۔ عمارت و محل وقوع مدرسہ وغیرہ اصول حفظ صحت کے موافق اور بچوں کی تعلیم ان کے معیار قابلیت کے مطابق ہونا چاہیئے ۔

مرکز مدرسہ فوقانیہ دارالشفا بلدہ | سال حال مدرسہ ہذا میں حسب ذیل جلسے ہوئے جن میں

مندرجہ ذیل حضرات نے خیالات ظاہر کئے۔ مولوی محمد عبد الشکور صاحب، مولوی سید حسین صاحب، مولوی عبد السلام صاحب ذکی، مسٹر چند رپا، مولوی امجد علی صاحب، مسٹر راج راجیا۔

"صحت دماغی"

طبقات تحتانیہ وسطانیہ فوقانیہ کے طلبہ کی دماغی کیفیت جدا جدا ہوتی ہیں کہ نئے طریقہ تعلیم بھی الگ الگ ہونا چاہیے۔ صحت دماغی اساتذہ وطلبہ کی تفہیم کر کے کیا گیا اور اساتذہ پر تعلیمی بار ضرورت سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ طلبہ میں حافظہ غائب دماغی وغیرہ کے نقائص پائے جاتے ہیں ان سے طلبہ کو آگاہ کرنا چاہیئے صحت دماغی کے لئے جسمانی صحت ضروری ہے طلبہ کو بُرے چال چلن سے بچانے پر زور دیا گیا۔ دماغ کو کبھی معطل نہ رہنے دینا چاہیئے۔ طلبہ کے دماغ کو سوالات کے ذریعہ بیدار رکھنا چاہیئے۔ اولیائے طلبہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اچھی غذائیں کھلا کر طاقتور بنائیں۔

"صفائی جماعت"

مدرسہ کے کمرے اصول حفظ صحت کے موافق ہوادار ہوں آدمر کا تصادم نہ ہو فرش اور دیواروں کی صفائی روزانہ ہوا کرے عمارت مدرسہ میں کئے دیئے لگوائے جائیں جو کھولے اور بند کئے جا سکتے ہوں بچوں کو نمناک فرش پر نہ بیٹھنے دیں ... کے لحاظ سے مدرسہ کا رنگ بدلنا اچھا اصول ہے پھر اس پر بحث ہوئی کہ طلبہ کے مابین ... فاصلہ چاہیئے اور تختہ سیاہ کیسے مقام پر رکھنا چاہیئے۔ یہ بھی بیان کیا گیا کہ اگرچہ ... اردو میں مشکل سے ہو سکتا ہے مگر ہر نوع کی صفائی پر ... کا اطلاق ہوتا ہے پھر صفائی کے تفصیلات پر روشنی ڈالی گئی۔

مرکز مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل بلدہ

سال حال مدرسہ ہذا میں حسب ذیل جلسے ہوئے جن میں مندرجہ ذیل حضرات نے خیالات ظاہر کئے۔ مولوی محمد عبد النور صاحب صدیقی، مولوی یوسف الدین احمد صاحب، مولوی سید حکیم صاحب، مولوی سید نور محمد صاحب، مسٹر الگوبند راؤ، مسٹر رام راؤ، مولوی محمد جان ...

مولوی محمد عبدالاحد صاحب، مسٹر یم لیا، مولوی عبدالحق صاحب، مولوی محبوب خاں صاحب
مولوی عبدالسلام صاحب زاہد، مولوی محمد غوث صاحب۔

"اصول حفظ صحت اور جسمانی صفائی"

مدرسہ کا محل وقوع مناسب اور روشنی ہوا دار ہو آبادی گنجان و تنگ تاریک نہ ہو پانی کا انتظام بیت الخلاء اور موریوں کا انتظام ضروری ہے طلباء آستین و دامن سے ناک صاف نہ کریں مدرسہ کے فرش پر تھوکنا جائز نہیں۔ عمارت مدرسہ اصول حفظ صحت کے موافق ہونا چاہیئے۔ دیواروں میں نمی نہ ہو۔ دریچوں سے پاک ہوا آئے۔ اساتذہ خود اصول حفظ صحت کے پابند رہیں۔

جسمانی صفائی سے مراد جلد، منھ، ناخن، بال اور بدن کے دوسرے اعضا اور کپڑوں کی حفاظت ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جسم کے اندرونی حصوں کی حفاظت کریں جسم کی حرارت کو اعتدال پر رکھیں بالوں کو صاف اور چکدار رکھیں پھر جلد کی ساخت اور مسامات کے کھولنے اور بدن کو دھونے منھ، دانت ناخن صاف رکھنے، لباس کی صفائی پر مفصل بحث کی گئی۔

"بچوں کے عام امراض اور ان کا انسداد"

کم سماعت و بصارت طلبہ کو نزدیک بٹھا کر تعلیم دینی چاہیئے
لکنت کا علاج یہ ہے کہ بچوں کو بار بار پڑھنے کا موقع دیا جائے۔ نفسیاتی اصول پر طلباء جس فن سے دلچسپی رکھتے ہوں ویسا ہی کام [illegible] کا احساس دماغ سے دور کرنا چاہیئے [illegible]

[illegible]

ہونا چاہیئے طلبار کے مابین ۱۸ انچ کا فاصلہ رہنا ضروری ہے

"ذہنی حفظ صحت"

طلبار کی صلاحیت کے موافق تعلیم دینی چاہیئے مشکل باتیں نہ بتائیں طلبار کی شرکت عمروں کے لحاظ سے ہونی چاہیئے نازیبا حرکات کا سدباب ناصحانہ طریقہ سے کیا جائے جسمانی سزا اور زائد از ضرورت ہوم ورک سے احتراز چاہیئے تختہ سیاہ کا عمل صاف ہو تاکہ بصارت پر بار نہ پڑے۔ مدرسے کے نصف اول اوقات میں دقیق مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں۔ مدرسین کی سخت گیری اور بدگوئی سے طلبار پر دہشت طاری ہوتی ہے ذہن معطل ہو جاتا ہے اس سے احتراز چاہیئے۔

"حفظ صحت متعلق جماعت مدرسہ"

مدرسہ اونچے مقام پر ہو جس میں دھوپ اور ہوا کا معقول انتظام ہو حفظ صحت کے اصول کے موافق لباس وغیرہ صاف رکھنے کی ہدایتیں دی جائیں۔ امراض متعدی سے بچوں کو بچانا چاہیئے جو بچے گندے میلے ہوں انہیں گھر واپس کر کے صفائی کی ہدایتیں دینی چاہئیں نگرانی رکھنی چاہیئے چھوٹے بچے آستین و دامن سے ناک صاف نہ کریں کتابیں اور کاپیاں پاک و صاف رکھیں۔ طلبار کی نشستیں باقاعدہ ہوں تختہ سیاہ پر روشنی منعطف ہو تعلیم در اصل دماغی نشوونما ہے سزائے جسمانی سے دماغ صحیح نہیں رہ سکتا جب دماغ صحیح نہ ہو تو پھر دماغی نشوونما کیسی سزا سے نہ صرف دماغ مرعوب بلکہ مفلوج ہو جاتا ہے۔

مرکز مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ	سال حال مدرسہ میں حسب ذیل جلسے ہوئے جن میں مندرجہ ذیل حضرات نے خیالات ظاہر کئے۔ مولوی

سعید الدین خاں صاحب، مولوی مصباح الدین صاحب، مولوی بہار الدین صاحب، مسٹر دونگے مولوی سید غوث الدین صاحب، مولوی عبد الجبار صاحب، مولوی احسان علی صاحب، مولوی محمد اسمٰعیل صاحب، مولوی غوث محی الدین صاحب، مولوی محمد فاضل صاحب، مولوی لیاقت علی خاں صاحب۔

"دماغی حفظ صحت"

ناقص دماغ افراد کے بے موقع اعمال استقامت تکمیل محافظ صحت دماغ ہے، تفنیات اور بیجا جذبات طبعی سے احتراز کرنا چاہیئے بچوں کی دماغی صحت کے لیئے اصول تعلیم سے کام لینا چاہیئے جو آسان ہوں اور دماغی قوی کو غلط نہ کریں حفظ صحت دماغی حفظ صحت جسمانی پر موقوف ہے، روحانی صدمہ شدید سنر البصری وسمی نقدان تکلم کا باعث ہے، طلباء کے دماغ پر زیادہ بار نہ ڈالنا چاہیئے۔

"مدرسہ اور اصول حفظ صحت"

مدرسہ کی عمارت اصول حفظ صحت اور مقاصد تعلیم کے مطابق ہونا چاہیئے۔ مدرسہ کے قریب باغ کا ہونا ضروری ہے تاکہ بچوں کو ہوا صاف ملے اور کاربانک اسیڈ گیس کو نباتات جذب کریں، مدرسہ کا محل وقوع ندی وغیرہ کے کنارہ ہو تو باعث ازدیاد فرحت ہے، عمارت مدرسہ کی خوشنمائی جاذب نظر و باعث انس طلباء ہے مدرسہ کے کمرے اغراض تعلیمی اور ماہران تعلیم کے خیال کے موافق ۳۰ × ۴۰ رقبہ کے، ایک منزلہ سقفی روشنی والے ہوں عمارت مدرسہ روغنی اور رنگین اینٹوں سے بنی ہوئی ہو کیونکہ چونے کی سفیدی آنکھوں میں خیرگی پیدا کرتی ہے۔

"طلباء کی عام بیماریاں اور اس کا علاج"

طبی اصول پر ضعف بصارت، آشوب چشم، ثقل سماعت، غدود کی بیماریوں، ضعف معدہ، قبض کی شکایت چار، نوشی کے نقصانات پر بحث کی گئی ہے پھر یہ بیان کیا گیا کہ مضمون کا مطلب ان امراض کو معلوم کرنا ہے جو تعلیم و تدریس سے متعلق ہیں دماغی وعصبی کمزوری، آنکھ کا ڈھیلا بڑھ جانا یا چھوٹا ہو جانا، آشوب چشم و ثقل سماعت، ناقص ٹائپ کی کتابوں، کمروں کی تاریکی وغیرہ کے نقصانات پر بحث کی گئی۔ اور اس کے انسداد کی صورتیں بتائی گئیں۔

"حفظ صحت اندرون جماعت"

روشنی اور اس کی قسموں، ہوا اور اس کی آمد و رفت، خراب ہوا کے نقصانات کلاس روم یا کمرہ جماعت کی نوعیت اور بلاک، بورڈ کے محل وقوع نیسے

تفصیلی بحث کی گئی۔ اور کہا گیا کہ ڈاکٹروں کے قول کے موافق ہر ساعت ۱۰ سو مکعب فٹ ہوا ہیا رہنا چاہیئے مدرسہ کی دیواریں پالش شدہ ہوں جو نمی کو جذب نہ کریں۔ سبز رنگ کی روشنی آنکھوں کو فرحت بخشتی ہے۔ تاریکی میں سمتی روشنی کا انتظام چاہیئے بچنیں پشت دار ہوں۔ ہر مضموں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ کمرہ ہو تاکہ بچوں کو حالت بدلنے اور باہر نکلنے کا موقع مل سکے۔ تختہ سیاہ سبز رنگ کا ہو تو آنکھوں کو فرحت دہ ہوگا۔

مرکز مدرسہ وسطانیہ مسعد پورہ	سال حال مدرسہ ہذا میں حسب ذیل جلسے ہوئے جن میں مندرجہ ذیل حضرات نے خیالات ظاہر کئے

مولوی غلام غوث خاں صاحب، مولوی سید جمیل الدین صاحب، مولوی محمد علی صاحب مولوی محمد حسین صاحب آزاد، مولوی محمد عبد الحنان صاحب، مولوی سید زین العابدین صاحب، مولوی سید غلام محمود صاحب، مولوی عبد الرحمان صاحب، مسٹر کریا مولوی سید فرید الدین صاحب۔

"حفظ صحت شخصی وغیرہ"

مغربی ممالک میں جس قدر اصول حفظ صحت کا لحاظ ہوتا ہے اس کا ذکر کرکے بیان کیا گیا کہ ہمارے یہاں نادار والدین بچوں کے لباس اور کھانے اور پینے کا معقول انتظام نہیں کر سکتے مدرس کو چاہیئے کہ وہ خود صفائی لباس کا نمونہ بن کر طلبا کی توجہ کا باعث ہو سالانہ جلسوں میں دوسرے انعامات کے ساتھ صفائی کا انتظام مقرر کرنا چاہیئے۔ شخصی صفائی کے علاوہ گھر کی صفائی اور گلی کوچوں پر بھی زور دیا گیا بچوں کو ہدایت کرنا چاہیئے کہ وہ جماعت کو کوڑا کرکٹ سے غلیظ نہ کریں جو لوگ حفظ صحت کے پابند ہوتے ہیں انہیں روحانی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ صوفیا نے لباس و جسم کی صفائی کو نصف ایمان بتایا ہے۔ ہفتہ میں کم از کم ایک دفعہ نہانا چاہیئے بچوں کو سن و شعور میں صفائی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ والدین کو چاہیئے کہ وہ خود صفائی کا نمونہ بنیں۔ بچوں کو نماز کا پابند بنانا چاہیئے

"حفظ صحت دماغی"

حواس کا استعمال بجا طور پر ہونا چاہیئے، کمزور بصارت والوں کو

نزدیک بٹھا کر تعلیم دی جائے اور عینک کی ہدایت دینی چاہیئے۔ حافظہ کی کمزوری کو ڈرائنگ سے فائدہ ہوتا ہے مشاہدہ کی کمزوری میں مشاہدہ کا عمل حقیقی طور پر کرائیں۔ مختلف ذہنیتوں کے طلباء کا خیال ضروری ہے بچوں کی ہر کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اہم اور سخت تعلیم ابتدائی ساعتوں میں دی جائے۔ ذہنی کام کے بعد سخت دماغی کام نہ لیا جائے اختیاری مضامین میں بچوں کے رجحانات کا خیال ضروری ہے جسمانی سزا سے دماغ پر برا اثر پڑتا ہے۔ رٹانے کی عادت بری ہے۔ حواس کی تربیت سے دماغ کی تربیت ہوتی ہے۔ ہوم ورک کے لئے نظام الاوقات مقرر کرنا چاہیئے بچوں کے رجحانات اور کمزوریوں کو معلوم کرکے اصلاح کرنی چاہیئے۔ تعلیم ایسی ہو کہ دماغ پر بیجا بار نہ پڑے۔

مرکز مدرسہ وسطانیہ سلطان بازار سال حال مدرسہ ہذا میں حسب ذیل جلسے ہوئے جن میں مندرجہ ذیل حضرات نے خیالات ظاہر کئے۔ مولوی صدر الدین صاحب، مولوی برہان الدین صاحب، مولوی خواجہ محبوب علی شاہ صاحب، مولوی وجیہ الدین صاحب، مولوی اعجاز علی صاحب، مسٹر لچھمن سنگلہ، مسٹر راجیا، مسٹر ویرا چندریا، مسٹر رنگاراؤ۔

"شخصی حفظ صحت"

شخصی حفظ صحت کے لئے جادۂ اعتدال پر گامزن رہنے کی نسبت وضاحت کی گئی اور اس کے وجودی و خارجی اثرات کا ذکر کرکے انسدادی تدابیر بتلائے گئے اور اصول حفظ صحت کے مطالعہ پر زور دیا گیا اور طلباء کی نسبت یہ بتایا گیا کہ انہیں ناخنوں اور دانتوں اور اشیاء نوشت و خواند کی صفائی کے لئے تاکید کرنی چاہیئے۔

"دماغی حفظ صحت"

نشل بانجین سے مراد قوائے دماغ کی صحت ہے اور دماغی صحت کا انحصار فطرت، تربیت اور دماغ کے صحیح استعمال پر ہے۔ نصاب تعلیم سہل ہونا چاہیئے تاکہ بچوں کے قوائے دماغ متاثر نہ ہوں قوت حافظہ اور ذہن کی تربیت ضروری ہے جسمانی صحت کے بغیر دماغ صحیح نہیں رہ سکتا، خوف اور بیجا تاثرات و تخیلات وغیرہ

سے دماغ کو محفوظ رکھنا چاہیئے۔

"عام امراض اطفال اور ان کا تدارک"

طلبا کے امراض غدود حلق و دندان کا انسداد ضروری ہے۔ قابض اشیاء سے احتراز چاہیئے تاکہ معدہ کے امراض پیدا نہ ہوں۔ عاملان تعلیم کا فرض ہے کہ وہ امراض طلبہ کے انسداد کی طرف توجہ کریں۔ نیز ان میں اصول حفظ صحت کا لحاظ ضروری ہے۔

"مدارس کی عمارتوں کی حالت بلحاظ صفائی و حفظ صحت"

مدارس کی عمارت اور محل وقوع اصول حفظ صحت کے مطابق ہوادار، پاک و صاف اور بلند مقام پر ہونا چاہیئے۔ بیت الخلاء کا بطور خاص لحاظ ضروری ہے۔ وضع قطع عمارت کی نسبت وضاحت کی گئی۔

"اساتذہ کی شخصیت کا اثر ضبط مدرسہ پر"

ضبط مدرسہ سے مدرس کی شخصیت کا گہرا تعلق ہے۔ اگر مدرس معائب جسمانی سے بری ہو تو طلبا پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے مدرس کی صورت لباس تحمل، ضبط، استقلال، عزت نفس جفاکشی وغیرہ یہ سب چیزیں اس بارہ میں نہایت موثر ہیں۔

حفظ صحت اندرون جماعت"

اصل مضمون کے متعلق مکان مدرسہ انتظام نشست طریقہ تعلیم کتب اور فرنیچر وغیرہ سے بحث کی گئی۔ چاک کے سفوف سے احتراز کی تاکید کی گئی کیونکہ یہ پھیپھڑوں کو خراب کرتا ہے۔ کمرے اصول حفظ صحت کے موافق بنائے جائیں ٹائم ٹیبل میں مضامین باعتبار وقت رکھے جائیں۔ تکان کے موقع پر اہم اور مشکل مضامین نہ ہوں طلبہ کو بال اور ناخن کٹوانے کی تاکید کریں۔

مرکز مدرسہ وسطانیہ قلعہ گولکنڈہ | سال حال مدرسہ ہذا میں حسب ذیل جلسے ہوئے

صحت جسمانی کا تعلق لوازمات مدرسہ سے"

صحیح دماغ صحیح جسم میں ہوتا ہے اس لئے صحت جسمانی ضروری ہے،

مدرسہ آبادی سینما یا شراب خانوں کلب طوائف اور جوا خانوں سے دور رہنا چاہیئے تاکہ ماحول کا برا اثر نہ پڑے۔ مدرسہ میں نشستوں کا انتظام اصول حفظ صحت کے مطابق ہونا چاہیئے تاکہ نوشت وخواند میں بچوں پر ان کی خمیدگی سے بچا جا۔ نہ پڑے پھر یہ بحث کی گئی کہ کیسے ڈسک نقصان دہ ہوتے ہیں اور کیسے آرام دہ خراب فرنیچر کے نقصانات تختہ سیاہ رکھنے کے مقام باغیچہ گیمس اور اسپورٹس کے سامان کی ضرورت پر بحث کی گئی۔

"طلباء کی بیماریاں اور ان کا علاج"

اگرچہ قابل علاج ہیں۔ مثلاً بخار، آشوب چشم، نازش پائریا وغیرہ۔ مثلاً نقل جھوٹ چوری سستی، دیر حاضری جوا کھیلنا مگر خلاقی بیماریاں قبیلہ اور قوم و ملک پر اثر انداز ہوتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ الانسداد میں جلسہ انعامات منعقد کرکے سرپرستوں کو بلایا جائے اور ان کو توجہ دلانا چاہیئے۔

"قلبی حفظ صحت"

قلبی صحت سے مراد یہ ہے کہ خدا کی محبت، حب الوطنی، تمنا ایثار، اطاعت، حق شناسی وغیرہ جملہ مکارم اخلاق دل میں موجود ہوں کیونکہ قلبی صحت سے جسمانی صحت پیدا ہوتی ہے اور قلبی بیماریاں مثلاً جھوٹ بزدلی، غرور، حسد، غصہ، خوف، بہتان، ظلم، چوری، جوا وغیرہ جسم پر اثر انداز ہوا کرتے ہیں پھر ان کے تفصیلات سے بحث کی گئی۔ اور کہا گیا کہ مدرسین کو چاہیئے کہ طلباء کے نقائص کی اصلاح کریں۔

"صحت جسمانی بلحاظ کمرہ جماعت"

کمرہ جماعت کا محل وقوع موزوں اور ہوادار اور موسم کے مناسب ہونا چاہیئے چھت ایسی ہو کہ چڑیا گھونسلے نہ بنا سکیں نمی نہ ہو تاکہ مچھر پیدا ہو کر ملیریا نہ پیدا کریں۔ اس کے ہوا روشنی طلبہ کے نشستوں اور تختہ سیاہ کی نوعیت وغیرہ پر تفصیلی بحث ہوئی۔ طلبہ کی خراب عادتوں مثلاً ان کا کاغذات پھاڑنا جماعت میں کوڑا کرکٹ ڈالنا تھوک سے غلیظ کرنے کا ذکر کرکے ان کو ان کاموں سے باز رکھنے کی تاکید پر زور دیا گیا۔

جلسہ الوداعی

عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کنٹب

۹ آذر ۱۳۴۷ف پنجشنبہ کا دن انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کی تاریخ میں اپنے شاندار مظاہروں اور وفورِ جذبات کے باعث یادگار رہے گا اس روز جناب مولوی سید علی اکبر صاحب سابق صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کو اسپیشل انسپکٹنگ افسر تعلیمات و معتمدی مجلس تعلیم ثانوی پر ترقی پانے کے سلسلہ میں مبارک باد دینے اور خدا حافظ کہنے کے لئے شاندار معیار پر عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا۔ اس موقع سے یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ مولوی فیض اللہ صاحب جعفری ایم، اے کنٹب بارایٹ لا حال صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کو پُرخلوص طریقہ پر خوش آمدید کہا گیا۔

آل سینٹ ہائی اسکول کا بازی گاہ اس تقریب کے لئے مختص تھا شامیانہ کی تزئین و آرائش اور نشستوں کا انتظام سلیقے اور تکلف کے ساتھ کیا گیا تھا۔

مدارس بلدہ سرکاری و غیر سرکاری کے اساتذہ صاحبان شریک جلسہ تھے۔ اور معزز مہمانوں کی تعداد بھی کافی تھی علاوہ خواتین کے سررشتہ تعلیمات کے تمام عہدہ دار تشریف فرما تھے۔ جناب محمد حسین صاحب جعفری بی اے آکسن ناظم تعلیمات، جناب مولوی سید اظہر حسین صاحب بی۔ اے (علیگ) ہوم سکرٹری جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب مولوی سجاد مرزا صاحب اور جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم، اے رجسٹرار کمشنر تنظیم تعلیمی بھی شریک جلسہ تھے۔

قرأت اور مدحیہ نظم کے بعد تقریریں ہوئیں مولوی عبدالستار صاحب سبحانی بی، اے، ال، ٹی صدر فوقانیہ دارالعلوم نے مدارس فوقانیہ کی نمائندگی فرماتے ہوئے کہا "آپ نے اپنی ملازمت کے دوران میں ہمیشہ محبت اور مودت کا سبق دیا اور

کبھی ہم نے محسوس نہیں کیا کہ ہم پر حکمرانی کی جا رہی ہے۔ آپ کے اخلاق ایسے تھے کہ آپ نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ اگر کوئی مدرس کسی خاص کام کے لئے موزوں نہ تھا تو آپ نے ہمیشہ صدر مدرس سے باصرار کہا کہ کوئی مناسب و موزوں کام دیا جائے اس طرح اس مدرس کو کارآمد بنایا گیا۔ آپ سے گہری عقیدت اور کام کے والہانہ جوش کے ساتھ اگر ہمیں کوئی خیال تھا تو یہی کہ ہم اپنی لاعلمی اور ناعاقبت اندیشی سے کوئی کام ایسا نہ کر گذریں جو آپ کے دل کو دکھ دے۔ ہم سب آپ کی ماتحتی سے خوش تھے اور آپ کی رضاجوئی کے لئے کام کرتے تھے جب کبھی ترقی کا موقع پیش آتا تو آپ اپنی رائے متزلزل نہ ہونے دیتے تھے اور جب تک کسی حق تلفی کی تلافی نہ ہو آپ کو چین نہ آتا تھا۔ مولوی صاحب موصوف نے مولوی فیض الدین صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے جملہ مدرسین کی وفا شعاری کا یقین دلایا اور کہا کہ آپ کی قابلیت اور صفات پسندیدہ کی بنا پر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا دور بھی ترقیوں کا حامل اور پرسکون رہے گا۔

مسٹر چنید اور کر ایم، اے صدر وسطانیہ سلطان بازار نے مدارس وسطانیہ کی نمایندگی کرتے ہوئے ایک بسیط تقریر کی جس کا لب لباب درج ذیل ہے۔

یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مستقر بلدہ پر جس قدر مفید اور تعلیمی سرگرمیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ اُن کا وجود آپ کی اَن تھک کوششوں اور دلچسپیوں کا رہین ہے۔ آپ کی ذات میں ہم ایک ہمدرد مشیر نہ کہ تخریب کن ناقد پاتے تھے۔ آپ کا معائنہ نصابی مضامین کی حد تک محدود نہ ہوتا تھا بلکہ آپ ہر معائنہ میں کسی نہ کسی زائد نصابی مصروفیت کا بیج بو کر جاتے تھے۔ آپ کی ماتحتی میں ہم نے کامل آزادی اور ایک عظیم الشان برادری کا لطف اُٹھایا۔ مدرسین میں وسعت نظر پیدا ہو اور وہ حالات کے اعتبار سے پیش پیش رہیں اس کا خیال آپ کو ہمیشہ رہا اسی کے حصول کے لئے رسالہ حیدرآباد ٹیچر جاری کیا گیا، انجمن اساتذہ، مدرسین کا کلب زائد نصابی مصروفیات، سالانہ نمائش تعلیمی وغیرہ معرض وجود میں آئے مدرسین کی حیثیت سے ہمیں کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں ملا تا دم آخر ہم تشکر و امتنان کے ساتھ آپ کی بے مثل سادگی اور فقید النظیر

شائستگی و شرافت نفس یاد رکھیں گے۔

اس کے بعد امپیریل کانفرنس لندن اور وفاق انجمن ہائے مدرسین ہند کے سالانہ کانفرنسوں میں آپ کی شرکت کا ذکر اور آپ کی تصانیف جرمن اسکول سسٹم اور ایجوکیشن انڈر آصف جاہ نیز آپ کی علمی اور لسانی قابلیت اور رسالہ حیدرآباد ٹیچر کے مدیر مسئول ہونے کا تذکرہ کیا۔ پھر گرمجوشی کے ساتھ مولوی فیض الدین صاحب کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آپ اس سمت میں نئے نہیں ہیں آپ کا دور بھی اپنے پیش رو کی طرح نمایاں کامیابی کا ضامن رہے گا۔ ریورنڈجی سندرم پرنسپل متعدد سٹ ہائی اسکول نے مدارس امدادی کی ترجمانی کی۔ موصوف نے مختصر مگر پرمغز تقریر میں کہا کہ آپ نے اپنی فطری خوش خلقی اور محیر العقول کارکردگی سے ہمارا دل موہ لیا آپ نے امدادی اور سرکاری مدارس کی تعبیر اس طرح کی جیسے ایک درخت کی دو شاخیں ہوتی ہیں جن کے ثمر ایک ہی ہیں اور جو زندگی کو خوش حال آسودہ اور مکمل بنانے میں یکساں خاصیت رکھتی ہیں۔ امدادی مدارس جن مشکلات میں مبتلا تھے اُن سے آپ ہمیشہ باخبر رہے۔ اگر مالی اعتبار سے ہماری پریشانیوں کو دور نہ کرسکے تو یہ ضرور ہوا کہ آپ نے وصف ذاتی اور ہمدردی سے ڈھارس بندھادی۔ مولوی فیض الدین صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے قابل مقرر نے فرمایا کہ آپ قابلیت ذاتی اور تجربہ وغیرہ سے لیس ہوکر تشریف لائے ہیں ہم کو یقین ہے کہ ہم آپ کی ماتحتی میں قابل قدر ترقی کریں گے۔ ہم آپ کے ہر منصوبے میں شریک ہونے اور کامل اشتراک عمل کا یقین دلاتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اس حلقہ میں آپ کا دور ملازمت آپ کی زندگی کا بہترین حصہ ثابت ہوگا۔

مدارس تحتانیہ کی جانب سے مولوی مظفر الدین صاحب نے حلقہ شمالی اور مولوی نعمت اللہ خاں صاحب صوفی نے حلقہ جنوبی کی نمایندگی کی۔ ہر دو حضرات نے پرزور تقریریں کیں اور ایسے جذبات عقیدت اور خلوص کا مظاہرہ کیا کہ حاضرین پر اس کا خاص اثر ہوا۔ دونوں حضرات نے مولوی سید علی اکبر صاحب کے اوصاف پسندیدہ، رواداری، خوش خلقی اور مساویانہ برتاؤ نیز تعلیمی ترقی مدارس وطلبہ کی تعدا

میں اضافہ اور آپ کی نفید المثال ہر دلعزیزی پر اچھی طرح روشنی ڈالی۔

اس موقع پر حضرات شعراء نے بھی جو ایسی تقریبات کا جزو لاینفک ہیں سرگرم حصہ لیا چنانچہ ان کے مدحیہ کلام کا ضروری اقتباس بطور نمونہ اس مضمون کے آخر میں درج کیا گیا ہے۔

مولوی سید علی اکبر صاحب نے ان تقاریر کے بعد پہلے جملہ عہدہ داران مدرسین اور مقررین کا شکریہ ادا کیا پھر مذاحیہ طریقہ پر کہا کہ مبالغہ نظم میں ایک حد تک مباح و جائز ہے مگر مقرر صاحبان ان سے بھی بازی لے گئے۔ سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ جو کچھ بھی کامیابی نصیب ہوئی وہ بڑی حد تک نواب مسعود جنگ بہادر مرحوم کی تربیت کا نتیجہ ہے جو ان کے دور نظامت میں حاصل ہوئی ان کے زمانہ نظامت کا نظم و نسق تین اصولوں پر مبنی تھا اولاً یہ کہ تمام معاملات کا تصفیہ ذاتیات سے ہٹ کر بلا رواداری کے کیا جائے۔ ثانیاً جملہ عہدہ داران اور مدرسین اشتراک عمل اور رشتہ مواخات میں منسلک ہوں ثالثاً سررشتہ کے وقار کو بڑھایا جائے۔ ان اصول پر کاربند ہو کر جو کچھ کام اس حلقہ میں ہوا وہ آپ کے اشتراک عمل اور اتحاد کا نتیجہ ہے اس کے بعد صاحب موصوف نے ان مسائل کی فہرست گنائی جو مزید توجہ کے محتاج ہیں مثلاً ضبط مدرسہ اور سیرت سازی وغیرہ۔

یہ امر موجب طمانیت ہے کہ زائد نصابی مشاغل کی قدر و قیمت روز افزوں بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ان مشاغل کی باقاعدہ تنظیم کر لی گئی تو یہ طلبہ کی سیرت سازی اور شہریت کی تربیت میں بمقابلہ اخلاقی تعلیم کے زیادہ موثر ثابت ہوں گے۔ سیرت سازی کی کوئی اسکیم اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتی جب تک کہ مدرس ان صفات کا جو وہ طلبہ میں پیدا کرنا چاہتا ہے نمونہ نہ بنے۔

انجمن اساتذہ حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے قائم کرنے میں دوگونہ مقصد تھے اولاً یہ کہ مدرسین کو اپنے پیشہ میں دلچسپی پیدا ہو اور دوسری یہ کہ اخوت کی روح ان میں سرایت کر جائے۔ شرکائے انجمن سے اپیل کی کہ وہ انجمن کے

ساتھ اپنی دلچسپی برقرار رکھیں اور مولوی فیض الدین صاحب کے تقریر پر خوشی ظاہر کرتے ہوئے شرکائے انجمن سے کہا کہ جیسا اتحاد عمل ان کے زمانہ میں رہا دہی مولوی فیض الدین صاحب کے ساتھ برقرار رکھا جائے۔

مولوی فیض الدین صاحب نے داعیان جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اطمینان دلایا کہ وہ اپنے پیش روکے نقش قدم پر چلیں گے۔ صدر جلسہ مولوی خان فضل محمد خانصاحب نے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ جس قدر تقریریں ہوئیں ان میں مبالغہ کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ بخلاف اس کے مدح و توصیف کا پہلو جس کے ہر دو اصحاب مستحق تھے کم تھا

انتخاب ملیحہ کلام

مولوی سید علی محمد صاحب اجلال مددگار مدرسہ فوقانیہ چنچلگوڑہ کی نظم ضروری قدر درج ذیل ہے۔ نظم کیا ہے گویا خلوص و عقیدت کا آئینہ ہے۔

اے علی اکبر وحید عصر یکتائے زمن
بحر تعلیمات میں اے گوہر نایاب فن

اے نظام شمس تعلیمات کے ماہ منیر
آسمان علم و فن کے نجم بے روشن جبیں

قدر کے قابل تری تعلیم سے دلچسپیاں
درسگاہوں کی زمینیں ہوئی ہیں آسمان

قابل صد آفریں ہے تیرا حسن انتظام
حق شناسی سے کیا ہر ایک کا ...

توشریف النفس حق آگاہ ہے منصف مزاج
محکمہ کو تھی تجھ ایسے افسروں کی ...

باوجود جاہ و عزت نام کو نخوت نہیں
تو ہے چشم فیض خود بینی تری فطرت ...

رہروان راہ تعلیمات کا رہبر ہے تو
افسری جس کے لئے زیبا ہے وہ ...

یہ زباں کہتی ہے رخصت کیجئے ہو کر حزیں
افسری کا وہ تعلق راست اب ...

دل یہ کہتا ہے زبان سے دے مبارکباد یاں
رتبہ وہ عالی دیا حق نے جو تھا شایان شان

پہلے جو ہم سب سے اکبر تھا وہ اکبر اب بھی ہے
افسری کا تاج جو پہلے تھا سر پر اب بھی ...

یہ سخن کے چند موتی ہیں بطور ارمغاں — ان سے ہے میری عقیدت در خلوص دل عیاں
یہ دعا اجلال کرتا ہے خدا سے بار بار — نیر بلاغ جاہ و عزت میں رہے ہر دم رواں

مولوی عبد الطاہر صاحب طاہر مددگار مدرسہ آل سنٹ ہائی اسکول کے دو ترجیع بند نمونتہً درج ذیل ہیں۔

آپ کے اخلاق کا شہرہ جہاں میں چار سو — آپ کی ہمدردیاں نوک زبان آرزو
تذکرہ ہے آپ کے ملنے والوں کی گفتگو — صاحبان علم و فن کو آپ کی ہے جستجو
آپ کی طبع رسا نقاد اہل علم و فن — اور ذہن نکتہ پرور ہے معانی کا چمن
اے خوشا محکوم جن کا ہے حاکم ہو — ہے نہایت عمدہ پسندیدہ ہو جس کا انتظام
اہل عملہ مانیں سر آنکھوں سے حکم خاص و عام — جان سے دل سے کریں حاکم کا اپنے احترام
پھر نہ کیوں شاد ہوں جب ہیں افسر دور رس — اے دل بجو بلا پھر ادبی رنجور رہو

مولوی محمد عبد السلام صاحب ذکی مددگار مدرسہ فوقانیہ دار الشفا نے ایک دلچسپ نظم پڑھی جس میں ظاہر کیا کہ چمن میں خزاں کا دور دورہ تھا موصوف کے انتظامات سے مدرسہ تو شگفتہ ہو گیا۔ آگے نمونہ کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

چمن کے گوشہ گوشہ میں کی اس نے تازہ گلکاری — مسیحائے چمن نے پھونک دی اک روح بیداری
غرض تھوڑے ہی عرصے میں پلٹ دی باغ کی کایا — گھٹا رحمت کی بن کر باغباں گلزار میں آیا
علی اکبر ہے ان کا نام نامی پوچھتے کیا ہو — وہ ہیں تعلیم علم و فن کے حامی پوچھتے کیا ہو
جدا ہوتے ہو اب ہم سے خدا حافظ خدا حافظ — ہمارے مونس و ہمدرد آشنا حافظ خدا حافظ
نغمہ ہوتا ہے ذکی آئین قدرت ہے — بہر صورت ادائے فرض تو اپنی عبادت ہے

مولوی محمد زکریا صاحب مائل مددگار مدرسہ فوقانیہ انوار العلوم نامپلی نے فضائل کی تمہید کے بعد مدحیہ بند پڑھے جو درج ذیل ہیں۔

ہے عقل دنگ کہ پھر ان کو اور کیا کہئے — اگر نہ علم و فضیلت کا مدعا کہئے
بجا یہی ہے کہ جو میں نے کہہ دیا کہئے — بس ان کو علم کی کشتی کا ناخدا کہئے
قبول کیسے حسن اہتمام ان کا — نہیں ہے شہر کے کس مدرسہ میں نام ان کا

وہ ہم سے ہوتے ہیں رخصت اب انکا صدمہ　　اگرچہ سہل نہیں رنج یہ ہیں سہنا
مگر خوشی سے اسے ہم نے دل پہ جھیل لیا ہے　　خوشی کا موقع ہے ایسے میں غم سے مطلب کیا
خدا کا شکر ہے دونوں کے بڑھ گئے رتبے　　وہ معتمد ہوئے چمکے نصیب مجلس کے
خدا کے فضل سے پھر جانشین بھی انکے　　ہیں علم و فضل و مروت میں لاجواب ایسے
بجا ہے مجمع خوبی اگر انھیں کہیے　　بڑی امیدیں ہیں قوم اور ملک کو ان سے
فیض دین ہیں تو ہے دین کو ان کی ذات سے فیض　　عیاں جبھی تو ہے ان کی ہر ایک بات سے فیض

مولوی امیر علی صاحب قادری صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ لال دروازہ نے دو شعر کا ایک قطعہ سنایا جس کے ایک شعر میں رنج و مسرت کا مضمون بطور لف و نشر مرتب بڑی خوبی سے آیا ہے جو ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

رنج ان کی جدائی کا ترقی کی خوشی ہے　　افسوس زبانوں پہ ہے ہونٹوں پہ ہنسی ہے

مولوی محمد حامد خان صاحب ہندی مددگار مدرسہ فوقانیہ انوار العلوم نامپلی نے ایک فارسی قصیدہ شعرا متقدمین کی طرز پر سنایا۔ مدح ممدوح کے چند شعر رقم ہیں۔

یکے ازاں کہ علی اکبرش ہمی گویند　　اگر کمال بنازد برو بود زیبا
ہنر پذیر و ہنر آور و ہنر آگاہ　　ہنر شناس و ہنر پرور و ہنر آرا
سمو و رفع و علا را وجود او تفسیر　　سمای شوکت و اجلال را درش معنی
مشار الیہ جہان شد مشیر تعلیمی　　پناہ علم و ہنر شد کمال را ملجا
اگرچہ شد متمکن بہ چرخ عز و شرف　　مگر نہ فیض جدا می شود ز ما اصلا

مولوی آقا محمد خاں صاحب طلعت مددگار مدرسہ فوقانیہ دار الشفا نے جو فارسی نظم سنائی ہے اس کے چند مدحیہ شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

ایں ترقی و تعالی را تو در ہر مدرسہ　　از عنایات شہ و رائے علی اکبر نگر
پرورش جاں معارف از علی اکبر گرفت　　علم و عرفاں را علم از سعی ایں افسر نگر
گر علی اکبر ز من پرسد چہ داری نذر با　　گوئمش اے محترم بر نظم ایں احقر نگر
از جمال ورد سے فیض الدین زرین رقم ادب　　چشم دل بکشا و رنگ و رونق دیگر نگر

من می گویم کہ از احوال طلعت غافلی — چوں بجالش بنگری باری ازیں بہتر نگر

مولوی محمد عبد المجید صاحب مجید مددگار مدرسہ فوقانیہ دار العلوم نے ایک فارسی نظم سنائی جس کا انتخاب بطور نمونہ درج ذیل ہے۔

چہ نام پاک علی اکبر ست نام شما — علو نام کشد اکبر مقام شما

حسین ناظم و نائب جو تو علی اکبر — نظام علم شود نو ز انتظام شما

کنوں کہ معتمد مجلس علوم اسیتد — بہار علم شود تازہ ز اہتمام شما

جناب فیض کہ فیضان خاص او عام است — ہمیشہ گام زند بر نقوش گام شما

مجید صبح و مسا انجمن ہمی گویند — ہمیشہ صبح شود تا نباک شام شما

اراکین کلب نے صاحب ممدوح کو ایک وداعی ڈنر دیا تھا۔ اس موقع پر عبد المجید صاحب فاروقی مددگار دار العلوم نے مدحیہ نظم سے حاضرین کو محظوظ کیا جس کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

ذرہ ذرہ عزت خورشید ہے — تیرا اے خاک وطن کیا پوچھنا

آج خورسند ہے حیدرآباد دکن — اس کا اک فرزند جو پھولا پھلا

محترم سید علی اکبر ہے وہ — تھا جو صدر مہتمم تعلیم کا

بورڈ کا تعلیم کے سکرٹری — ملک کی خوش قسمتی سے ہو رہا

قابلیت ارفع و اعلیٰ بہت — وہ اسی قابل تھا اس سے سوا

صاحب فضل و کمال و علم و فن — فاضل و علامہ مستشرق بڑا

اپنے ہر چھوٹے سے وہ چھوٹا رہے — ہر بڑے سے وہ نظر آئے بڑا

جانے کس کس انجمن کا صدر ہے — صدر لیکن اس کلب کا ہے بڑا

عمر خیر و عافیت سے ہو دراز — صدق دل سے ہے کلب کی یہ دعا

ہو ترقی پر ترقی رات دن — دولت و اقبال ہو حد سے سوا

افتتاحیہ

صدر انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد

مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے کنتب صدر انجمن اساتذہ و مدیر مسئول رسالہ ہذا نے اب سے چودہ سال پیشتر ۲۹؍ آذر ۱۳۳۳ف کو صدر مہتمی تعلیمات بلدہ کا جائزہ لیا۔ اسی سال ہماری انجمن کے افتتاح کی کارروائی (جس کے اغراض و مقاصد کے نشر کا رسالہ ہذا آرگن ہے) صاحب ممدوح نے شروع کی۔ محکمہ سرکار سے قواعد کی منظوری اور دفتری کارروائی ہوتے ہوتے ایک سال گزر گیا۔ اس لئے انجمن کا باضابطہ افتتاح ایک سال بعد یعنی ۱۳۳۴ف میں عمل میں آیا جب سے اب تک اس انجمن کے بانی اور موسس اعلیٰ یعنی مولوی سید علی اکبر صاحب ہی انجمن کے صدر رہے اور اس کے چھوٹے بڑے ہر معاملہ میں ذاتی دلچسپی لی۔ اب چونکہ آپ نے بہ عہدہ سکریٹری بورڈ آف ایجوکیشن و اسپشل انسپکٹنگ افسر تعلیمات ترقی پائی ہے اور بلحاظ قواعد عہدہ صدر مہتمم وقت کو صدر انجمن ہونا چاہئے اس لئے آپ صدارت انجمن سے سبکدوش ہوگئے۔

ان آنکھوں نے وداعی جلسہ میں جو کچھ بھی مناظر دیکھے اس کی روئداد علیحدہ شائع کی گئی ہے۔ وہ وداعی جلسہ نہ تھا بلکہ دل و دماغ کی ایک والہانہ کشمکش تھی یا ان کا باہمی تصادم تھا۔ گو عقل سلیم کو یہ باور کرنے کا موقع تھا کہ ترقی ملی، درجہ بلند ہوا اس لئے خوش ہونا چاہئے مگر دل نہیں مانتا تھا۔ سال چھ مہینے نہیں بلکہ پورے چودہ برس کا ساتھ چھوٹا جس میں ہم نے ایک دوسرے کو بخوبی دیکھا بھالا اور جانا پہچانا۔ مختلف حیثیتوں میں اپنے صدر کو کام کرتے ہوئے کانفرنس کے جلسوں، تقاریر، اسباق نمونہ، باغبانی کے مقابلوں اور نمائش کی تیاریوں میں بذات خود دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا۔ جو حضرات ان امور کی حقیقت سے واقف ہو کر وداعی جلسہ میں شریک تھے یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہوں گے کہ اس وقت کی

دل و دماغ کی والہانہ کشمکش یا ان کا باہمی تصادم کس قدر حق بجانب تھا۔ ایک شاعر نے اسی جلسہ میں ہمارے جذبات کی بڑی خوبی سے ترجمانی کی ہے ؎

رنج اُن کی جدائی کا ترقی کی خوشی ہے　　افسوس زبانوں پہ ہے ہونٹوں پہ ہنسی ہے

آپ کی ذات والاصفات بمنزلہ ایک الکٹرک پاور ہاؤس ایک ڈائنمو یا خورشید خاور کے تھی جس سے ہر شخص تقویت پاتا اور کسب ضیا کرتا تھا۔ آپ نے حکومت نہیں کی مگر دلوں کو رام اور مسخر کر لیا تھا۔ حضرت غفران مکان نور اللہ مرقدہ کا شعر کس قدر برمحل ہے

ہوتے ہیں زر و سیم پہ سب کے سکے　　ہم وہ ہیں کہ سکہ ہے دلوں پر اپنا

اب ہم جذبات سے ہٹ کر ان اصلاحات پر طائرانہ نظر ڈالیں گے جو اس دور میں پایۂ تکمیل کو پہنچے یا جن کے سرسبز ہونے کی توقع ہے۔

صدر مہتممی تعلیمات بلدہ کا جائزہ لینے کے دوسرے سال ۳۴ء میں انجمن اساتذہ کا افتتاح ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ علمی اور نفسیاتی مباحث سے جن کا جاننا اساتذہ کے لئے ازحد ضروری ہے وہ باخبر اور پیش پیش رہیں چنانچہ مدرسین بلدہ نے کم و بیش ۱۴۰ عنوانات پر اب تک بحث کی ہے۔ یہ وہ مسائل تھے جن کا تعلق براہ راست اُن کے پیشہ سے تھا اور وہ تعلیمی اور نفسیاتی اہمیت رکھتے تھے۔ مدرسین کو ہر مہینہ میں ایک مرتبہ ایک جگہ جمع ہونے اور میل جول بڑھانے اور رشتہ مواخات سے منسلک ہونے کا جو موقع ملا اور فوائد حاصل ہوئے وہ مزید برآں ہیں۔

انجمن کے قیام کی یہ غرض تھی کہ ملک کے طول و عرض میں اُس کے مقاصد و اغراض کو پھیلایا جائے اس کے لئے رسالہ کا اجرا عمل میں آیا جس نے ابتدائی دور کی کٹھن منزلیں طے کر لیں، مالی حالت استوار ہو گئی اور وہ اپنے پیر پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ رسالہ حیدرآباد ٹیچر ممالک محروسہ سرکار عالی کا ایک خاص تعلیمی آرگن ہے جو مدرسین کے لئے مختص ہے جس میں حشو و زوائد یا قصے کہانیاں نہیں بلکہ ٹھوس تعلیمی مضامین انگریزی اور اردو میں شائع ہوتے ہیں رسالہ نے اپنے دور حیات میں کچھ نہیں تو تقریباً تین ہزار صفحہ کا مواد اردو میں اور اتنا ہی انگریزی میں پیش کیا۔ رسالہ کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ تعلیمی

مباحث پر قلم اٹھانے والوں کا قحط تھا اس کے صفحات مغربی تجارب علمی اور نفسی سے مالا مال رہے۔ یہ سب انجمن کے صدر اور رسالہ ہذا کے مدیر مسئول کی دلچسپیوں کا نتیجہ ہے جو اس کے مدیر مسئول ہی نہیں بلکہ مضمون نگار، مصحح، پروف ریڈر سب ہی کچھ تھے بمصداق خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ۔ آپ نے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں دلچسپی لے کر انجمن میں تازہ روح پھونک دی۔

انجمن کے اغراض کو ملک کے طول و عرض میں پھیلانا چھوٹا منھ بڑی بات تھی شروع میں اغیار نے چہ میگوئیاں کیں۔ مگر اب رسالہ کی اشاعت (۹۰۰) ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل کہاں تک ہوئی۔ اس کے ماسوا ذیل میں اور بہت سے امور درج کئے جاتے ہیں جو اس دور میں انجام دئے گئے جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ انجمن سے تعلق تھا۔

۳۳ف میں صدر انجمن اساتذہ بلدہ نے ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علیگڈھ میں شرکت کرنے کے بعد تعلیم بالغاں پر رپورٹ پیش کی اور ایک ماڈل پرائمری اسکول کی تحریک فرمائی جس میں کنڈر گارٹن اور طریقہ مانٹی سوری کے تعلیم کی اردو میں حمایت کی گئی تھی۔ موجودہ ماڈل پرائمری اسکول اس تحریک کا مادّی ثبوت ہے۔ محترم صدر نے تعلیم بالغاں پر اسی زمانے میں کئی پبلک لکچر دئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد مدارس شبینہ قائم ہو گئے۔ ۳۵ف میں ۶ تا ۱۲ سال کے طلباء جو صدر و صفائی میں تقسیم ہیں ان کا شمار کر کے رپورٹ پیش کی گئی۔ یہ جبری تعلیم کا مقدمہ تھا چنانچہ اسی بناء پر دو سال بعد یعنی ۳۷ف میں منجانب سرکار آپ کو میسور بھیجا گیا وہاں کے نظام تعلیم کا خاکہ دیتے ہوئے آپ نے جبری تعلیم کے تفصیلات پیش فرمائے۔

۳۶ف میں آپ کو امپیریل ایجوکیشن کانفرنس لندن میں شرکت کے لئے منجانب سرکار بھیجا گیا جس کی رپورٹ بھی اہتمام اور شرح و بسط کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

۳۰ف میں معائنہ طبی طلبائے مدارس کے بارہ میں رپورٹ پیش کی گئی الحمد للہ یہ تحریک بار آور ہوئی نہ صرف ملیریا ڈپارٹمنٹ کی جانب سے بچوں کے طحال وغیرہ

کا معائنہ ہو رہا ہے بلکہ علیحدہ ڈاکٹر مامور ہو چکے ہیں جو نہایت تفصیلی معائنہ کرتے ہیں۔

۳۹ف میں نظامت تعلیمات کی مقررکردہ سب کمیٹی تعلیم تاریخ وجغرافیہ میں شرکت کی گئی اور نصاب کی تیاری عمل میں آئی۔ ان مضامین کی تعلیم اور نصاب میں جو کچھ تبدیلی اور اصلاح ہم دیکھتے ہیں وہ سب کمیٹی مذکور کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

۴۰ف میں بربناء حکم خداوندی نواب صلابت جاہ بہادر کے دورہ یورپ میں آپ ساتھ رہے اور اسی سال آل ایشیا تعلیمی کانفرنس منعقدہ بنارس میں شرکت فرمائی اور وہاں سے کلکتہ جاکر بہرے گونگے اور اندھے طلباء کے مدارس کا معائنہ فرمایا اور بعد واپسی ایسے طلباء کے لئے مخصوص مدارس کے قیام کی اسکیم پیش کی جو اب بارآور ہوتی نظر آتی ہے۔

۱۳۴۱ف میں ماڈل پرائمری اسکول کا قیام عمل میں آیا اس کا جزئی اور کلی انتظام صاحب موصوف ہی نے کیا۔ اسی سال آپ کی معرکتہ الارا تصنیف جرمن اسکول سسٹم انگریزی میں طبع ہوئی جس نے اہل فن سے خراج تحسین حاصل کیا۔

۱۳۴۴ف میں شاہی وصرفخاص کے مدارس کی تنظیم کے لئے رپورٹ پیش کی اور تحتانوی تعلیم کی توسیع واصلاح کے لئے بھی تفصیلی اسکیم پیش فرمائی۔

۱۳۴۵ف میں وفاق انجمن ہائے اساتذہ ہند کے سالانہ جلسہ منعقدہ گوالیار نیز ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت عمل میں آئی۔ ۴۶ف میں بہ تقریب سلور جوبلی سررشتہ تعلیمات کی تاریخ ایجوکیشن انڈر آصف جاہ دی سونتھ شائع کی گئی۔ جس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وقتاً فوقتاً خصوصی لکچروں کا انتظام عمل میں آیا۔ یہ سب مولوی سید علی اکبر صاحب کی دلچسپی اور ادبی ذوق کی دلیل ہے کہ حیدرآباد میں جب کبھی کوئی بڑا آدمی آیا تو اس کے زرین خیالات سے مستفید ہونے کا موقع اراکین انجمن کو بھی بہم پہنچایا۔

انجمن کی سرپرستی اور آپ کی رہبری میں اب تک ۱۷ سب کمیٹیاں مقرر ہوئیں جن کی رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں یہ کام کچھ ایسا نہیں ہے کہ معمولی سمجھا جائے رپورٹیں

ان اہم مسائل سے متعلق ہیں جن کی ضرورت میدان تعلیم میں مسلمہ اور اہم ہے۔ یہ کسی رکن کی تنہا کوششوں کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ گھنٹوں اراکین انجمن سر سے سر جوڑ کر بیٹھے اور عرق ریزی کے ساتھ رپورٹ مرتب کی۔

حال ہی میں زائد نصابی مشاغل کے ادارہ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ کام شروع ہوچکا ہے اس کی روز افزوں اہمیت کے مدنظر یقین ہے کہ مستقبل قریب میں غیر معمولی ترقی ہوگی جس سے طلبا کی سیرت سازی میں بیش بہا مدد ملے گی۔

مختصر یہ کہ ہمارے صدر، انجمن کے روح رواں تھے یہ پودا لگایا ہوا آپ ہی کا ہے جس کی آبیاری خون دل سے کی گئی۔ اراکین کا فرض ہے کہ اس کو پھلتا پھولتا رکھیں۔

حال صدر انجمن جناب مولوی محمد فیض الدین صاحب ایم اے کنٹب بار ایٹ لا کا پرخلوص استقبال اراکین انجمن کی طرف سے ادا کرتے ہوئے ہم اپنے اشتراک عمل و اتحاد کا کامل اطمینان دلاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی رہبری و قیادت میں انجمن نمایاں ترقی کریگی۔

قطعہ تاریخ

بہ تقریب ترقی عالیجناب سید علی اکبر صاحب

معتمد علمی جماعت کے علی ٭ سن بلندی نے کہا سر کو جھکا
۱۳۵۶ھ

کرکے فرش راہ سر اقبال نے ٭ معتمد تعلیم کے اکبر کہا
۲ ۱

از مولوی عبدالمجید صاحب فاروقی ۱۳۵۶ھ

شذرات

نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات وسیاسیات کا دورہ محبوب نگر

یکم ماہ ۔ روز جمعہ۔ موجب پروگرام نواب ظہیر یار جنگ بہادر اول تعلقدار، مولوی اسد حسین خان صاحب صدر مہتمم تعلیمات سمت میدک، مولوی سید مہدی علی صاحب بلگرامی مہتمم تعلیمات، مسٹر آر۔ وینکٹ راؤ مانویکر صدر مدرسۂ فوقانیہ بحیثیت ویلر مہدی رد ان و تعلقدار و معززین مقامی استقبال کے لئے موضع ین گنڈہ پہنچے جہاں براے کارہائے انتظام دیہی پہلے سے ہی پہنچ چکے تھے۔ وقت مقررہ پر نواب صدر المہام بہادر مولوی سید محمد حسین جعفری ناظم تعلیمات کی معیت میں نائرین گنڈہ ہوئے صاحب ضلع کے استقبال اور حاضرین سے تعارف کے بعد موضع کی آبادی کا معائنہ فرمایا گیا جہاں کہ صاحب ضلع و مولوی مصلح الدین صاحب تحصیلدار کی کوششوں سے تنظیم دیہی کا کام معقول پیمانہ پر ہو چکا ہے۔

نو تعمیر چاوڑی میں طلبائے مدرسہ مدرس صاحب کی زیر نگرانی مصروف درس و تدریس تھے جن کا کارہائے تنظیم دیہی کے ساتھ مکرر قیام عمل میں آیا ہے۔ کارہائے تنظیم دیہی کو ملاحظہ فرما کر اظہار خوشنودی کیا گیا۔ چاوڑی کے روبرو کچھ دیر توقف اور مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدوسی بی۔ اے۔ یل یل بی وکیل کی تقریر موسومہ موضع ین گنڈہ کی تنظیم ترقیات سماعت فرمانے کے بعد نواب صاحب ممدوح الشان نے تنظیم دیہی کی ضرورت واضح فرمائی اور دیہی رعایا سے ملنے اور ان کے حالات کا مشاہدہ کرنے کا موقع حاصل ہونے پر اظہار مسرت فرمایا۔ پنڈت نارائن راؤ صاحب وکیل نے انہیں ہمدردانہ خیالات کی ترجمانی بزبان تلنگی کی۔ جملہ حاضرین، طلبا مدرسہ وجمیع رعایا دیہی کے ساتھ نواب صاحب معز کی تصویر کشی ہوئی۔ ساڑھے پانچ بجے

عہدہ داراں وغیرہ کی ہمراہی میں محبوب نگر روانہ ہوئے انگلش بنگلہ میں قیام عمل میں آیا جہاں پولیس کے دستہ نے سلامی دی۔ نواب ظہیر یار جنگ بہادر میر مجلس آفیسرز کلب کی استدعا پر آپ کی دعوت قبول فرمائی گئی۔ عمارت کلب کی آراستگی سلیقہ سے عمل میں آئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے نواب صدر المہام بہادر بہ ہمراہی جناب ناظم صاحب تعلیمات کلب تشریف لائے۔ عہدہ داران و اراکین کلب نے استقبال کیا۔ بعد فراغت طعام نواب صاحب ممدوح نے حاضرین کو تقریباً ایک گھنٹہ تک تبادلۂ خیالات کا موقع عطا کیا۔ مسئلہ تعلیم پر نواب صاحب کے خیالات سے جمیع حاضرین متفیض ہوتے رہے مولوی مرتضیٰ خاں صاحب سیول لین منصف و معتمد کلب نے منجانب اراکین نواب صاحب کی تشریف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔ جواباً نواب صاحب نے عہدہ داران و اراکین کلب کا شکریہ ادا فرماتے ہوئے توسیع تعلیم کے مسئلہ پر اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا۔ ازاں بعد مراجعت فرمائی عمل میں آئی۔

۲؍ دے ۱۳۴۸ف روز شنبہ۔ نواب صدر المہام صاحب بہادر نے صاحب ضلع کی ہمراہی میں محکمہ اول تعلقداری کی جدید عمارت کا صبح ۹ بجے معائنہ فرمایا۔ ازاں بعد مدرسہ کی اراضی کا معائنہ اور حصول اراضی کا تصفیہ بلحاظ ضروریات سررشتہ فرمایا۔ ہمراہی میں جناب ناظم صاحب تعلیمات و صاحب ضلع تھے۔ موقع پر صدر مہتمم صاحب و مہتمم صاحب تعلیمات پہلے ہی سے موجود تھے۔ ساڑھے ۹ بجے مدرسہ فوقانیہ کے معائنہ کے لئے تشریف لے گئے۔ جمیع عہدہ داراں تعلیمات ہمراہ تھے۔ صدر مدرس نے کے استقبال اور اسکوٹ ٹروپ کی سلامی کے بعد مدرسہ کا تفصیلی معائنہ کیا گیا قابل اطمینان حالت اور صدر مدرس صاحب کی حسن کارگذاری پر مسرت اور خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد محکمۂ اول تعلقداری کی قدیم عمارت کا معائنہ ہوا جہاں مولوی سید علی اصغر صاحب مددگار مہتمم تعمیرات موجود تھے۔ ناظم صاحب تعلیمات کی تحریک پر نواب صاحب نے اس عمارت کو مقامی مدارس کے لئے موزون قرار دیتے ہوئے تشخیص معاوضہ کے لئے ارشاد فرمایا بعد ازاں دواخانہ و جیل کا معا

عمل میں آیا۔ صاحب ضلع، عہدہ داران تعلیمات و ڈاکٹر افتخار الدین حسین صاحب سیول سرجن ہمراہ تھے۔ دواخانہ اور جیل کے متعلق متعدد امور سیول سرجن صاحب سے دریافت فرماتے رہے۔ دواخانہ کی منظم حالت اور جیل خانہ کی صفائی پر نواب صاحب نے اظہار مسرت فرمایا۔ سہ پہر میں کار ہائے تنظیم دیہی کے معائنہ کے لئے ناظم صاحب و مہتمم صاحب تعلیمات کے ہمراہ راہی موضع بوتے پلی ہوئے جہاں صاحب ضلع نے عہدہ داران مقامی و اراکین سدر بنک امداد باہمی محبوب نگر کے ساتھ استقبال کیا۔ نواب صاحب نے کار ہائے تنظیم دیہی کا معائنہ کیا اور دوران معائنہ میں باڈریس رضاکار ریپرایسیاں تحریکات کو جو صرف انتظام تھے اور صاحب ممدوح الشان نے اطراف رعایا کے احتجاج میں مانع و مزاحم ہو رہے تھے انتظام سے باز رکھا۔ نواب صاحب کے اس ناقابل فراموش درس مساوات سے حاضرین بیحد متاثر ہوئے۔ یہیں پر موضع کے جدید تعمیر شدہ بلند و کشادہ ہال میں جشن یوم امداد باہمی منجانب سدر بنک منایا گیا جس کی نواب صدر المہام بہادر نے صدارت کی۔ باڈریس طلبائے مدرسہ کے ترانہ شاہی پڑھنے کے بعد آغاز کارروائی جلسہ کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔ ترانہ امداد باہمی کے بعد مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب ناشر انجمن اور محمد اسحاق صاحب و احمد عبداللہ صاحب صدری وکلاء کی تقریریں ہوئیں اور نواب صاحب کی قیادت میں جشن منائے جانے پر خوشی اور خوش بختی کا خاص طور پر ذکر رہا۔ صدارتی تقریر میں دیہی ترقیات و اصول امداد باہمی کی اہمیت کا اظہار کیا گیا۔ موضع بوتے پلی میں ایک امدادی مدرسہ کے قیام کی جو استدعا ناشر صاحب انجمن نے پیش کی تھی اور جن کی تحریک منجانب سررشتہ ارباب صدر کی جاچکی تھی نواب صاحب نے بمسرت اعلان فرمایا کہ اس خصوص میں رعایا موضع کی استدعا تکمیل پاچکی ہے۔ صدارتی تقریر کا خلاصہ پنڈت نارائن راؤ صاحب وکیل نے تلنگی میں بیان کیا۔ حضرت اقدس اعلیٰ کی درازی عمر کے لئے دعا کے ساتھ جلسہ برخاست ہوا۔

یہاں سے نواب صدر المہام بہادر جلسۂ تقسیم انعامات کی شرکت کے لئے مدرسہ فوقانیہ تشریف لائے۔ اولاً مدرسہ کے جدید والی بال کورٹ کا افتتاح فرمایا اور مدرسہ کے بین الجماعتی کھیلوں کے آخری مقابلہ کو جو اسی کورٹ پر جماعت ہشتم و جماعت ہفتم کے مابین کھیلا گیا ملاحظہ فرمایا۔ اس میں ہفتم جماعت کامیاب رہی۔ اس مقابلہ کے بعد مدرسہ اور پولیس و مقامی کھلاڑیوں کی مشترکہ ٹیم میں فٹ بال کا مقابلہ ہوا افطار کا وقت ہو جانے اور ٹیموں کے برابر رہنے کی وجہ کھیل روک دیا گیا۔ منجانب انجمن اساتذہ مستقر محبوب نگر مدرسہ میں افطار کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس سے فراغت پاکر حاضرین نے نماز مغرب باجماعت ادا کی۔ نماز کے بعد طلباء مدرسہ نے بیانڈ کے ساتھ مشعل کے ذریعہ ڈرل کی جس کو پسندیدگی نظر سے دیکھا جارہا تھا۔ مولوی محسن الدین صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ نے مدح میں ایک نظم سنائی بعد ازاں صدر مدرسہ نے صدر المہام بہادر سے تقسیم انعامات کی استدعا کرتے ہوئے صوبہ گورنمنٹ میں مدرسہ کی متعدد ٹیموں کی کامیابی، صدر مہتمم صاحب کی توجہ سے مدرسہ کے عقب میں بازیگاہ کی تیاری لیکن تمام کھیلوں کے لئے اس کا کافی نہ ہونا اور ایک میدان کی ضرورت، مدرسہ کی گزشتہ ایک سال میں تعلیمی ترقی، امتحانات میں قابل اطمینان نتائج کا ذکر کیا اور دیہات و تعلقات کے طلباء کے لئے دارالاقامہ کے قیام کی ضرورت ظاہر کی۔ نواب صاحب نے تقسیم انعامات کے بعد مدارس کی تنظیم جدید اور ابتدائی تعلیم کی توسیع کے متعلق اپنے بیش بہا خیالات سے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ مدرسہ کی تعلیمی حالت پر اطمینان کا اظہار اور صدر مدرسہ کی کارگزاری کی ستائش کی گئی۔ کہا گیا کہ ایسے ہی محنتی اور مستعد عہدہ داروں کی ضرورت ہے جن کی کارگزاری پسندیدگی سے دیکھی جائے گی اور ان کی حوصلہ افزائی کیجا کر دوسروں کے لئے مثال قائم کی جائے گی۔ صدر مدرسہ کی پیش کردہ ضروریات کی نسبت کہا گیا کہ بلحاظ ضرورت مدارس میں قیام دارالاقامہ کا مسئلہ زیر تصفیہ ہے بازیگاہ کے لئے مزرعہ کی خریدی کا تصفیہ عنقریب ہو جائے گا۔

آخر میں مہتمم صاحب تعلیمات نے صدرالمہام بہادر و جملہ حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔
شب میں ایوان تعلقداری میں نواب ظہیر یار جنگ بہادر نے پر تکلف ضیافت
کا انتظام کیا تھا جس میں مہمانوں کے علاوہ مقامی عہدہ دار و معززین وغیرہ مدعو تھے۔

---

۴ ہر دے شہریور روز یکشنبہ۔ صبح ۹ بجے صدرالمہام بہادر بہمراہی ناظم صاحب
تعلیمات مشہور برگد کا درخت دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ درخت محبوب نگر
سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے جس کی بلندی (۶۰) فٹ اور دور (۱۱۲۵)
فٹ ہے۔ اس کے زیر سایہ دو بزرگوں کے مزار ہونے کی وجہ سے "پیرلہ سری"
یعنی پیروں کے درخت کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پر صاحب ضلع اور بعض
دیگر مقامی عہدہ دار وغیرہ صبح ہی سے موجود تھے۔ ۲۰ منٹ قیام اور درخت
کی قدرتی فضا سے لطف اندوز ہونے کے بعد واپسی ہوئی اور از راہ تفنن ارشاد
ہوا کہ دیہی مدارس کے لئے ایسے قدرتی سایہ دار مقام موزون ہیں۔ واپسی میں
دفتر مہتممی تعلیمات کا معائنہ ہوا عمارت کے محل وقوع کو پسند کیا اور دفتر کی پاکیزہ
حالت پر اظہار مسرت فرمایا گیا دس بجے مدارس مقامی کے معائنہ کے لئے روانگی
عمل میں آئی جو تعداد میں چار ہیں۔ ہر مدرسہ پر خیر مقدمی اشعار آویزاں کئے گئے تھے۔
اولاً مارل سکول کا معائنہ ہوا جہاں پر سوم جماعت تک تعلیم ہوتی ہے۔ مدرسہ
فوقانیہ کی قدیم سرکاری عمارت میں قائم ہے نواب صاحب نے تفصیلی معائنہ
فرما کر مسرت کا اظہار کیا۔ بعد ازاں مدرسہ نسواں اردو، مدرسہ ابتدائیہ، مدرسہ
نسواں تلنگی کے یکے بعد دیگرے معائنے ہوئے اور تعلیمی حالت سے مطمئن ہو کر
ارشاد ہوا کہ قدیم عمارت اول تعلقداری کے حصول کے بعد مدارس مقامی کے لئے
موزوں امکنہ کا مسئلہ بھی تصفیہ پا جائیگا۔
شام میں پانچ بجے صدرالمہام بہادر بمعیت جناب ناظم صاحب تعلیمات
تفریح گاہ "مرزا گھاٹ" کا محکمہ جنگلات کی جدید تعمیر کردہ سڑک کے ذریعہ

معائنہ فرمایا واپسی میں ہیڈ کوارٹر پولیس گرونڈ تشریف لے گئے جہاں طلبا مدرسہ وجمیعت پولیس کے درمیان ہاکی میاچ مقرر تھا۔ مولوی ہدایت علی صاحب مہتمم پولیس کی سرکردگی میں گارڈ آف آنرنے سلامی دی۔کھیل کے ختم پر پولیس کی ڈرل کا مظاہرہ ہوا۔مغرب کے قریب واپسی ہوئی۔ شب میں ساڑھے آٹھ بجے مدرسہ فوقانیہ تشریف لائے جہاں مقامی عہدہ داران تعلیمات کی جانب سے مدرسہ کے ہال میں ڈنر کا انتظام تھا۔ ڈنر کے دوران میں پولیس کا بیانڈ سامعہ نوازی کر رہا تھا۔ ڈنر کے آغاز سے قبل فلیش لیٹ فوٹو لیا گیا۔ڈنر کے اختتام پر صدرالمہام بہادر نے حضرت اقدس واعلیٰ کا جام صحت تجویز فرمایا جمیع مہمانوں نے ایستادہ ہو کر بندگانعالی کا جام صحت نوش کرنے کی عزت حاصل کی۔ بعد ازاں ناظم صاحب تعلیمات نے نواب صدرالمہام بہادر کا جام صحت تجویز کرتے ہوئے ایک برجستہ تقریر فرمائی جس میں نواب صاحب کے اوصاف حمیدہ اور ممدوح کے مبارک دور کی تعلیمی ترقیوں پر روشنی ڈالی گئی۔ اسی سلسلہ میں ضلع محبوب نگر کی تعلیمی ترقی، مدرسہ فوقانیہ کی عمدہ تعلیمی حالت، عہدہ داران تعلیمات ودیگر عہدہ داران مقامی میں تعاون واشتراک عمل اور صاحب ضلع و دیگر عہدہ داران کا امور تعلیمی سے دلچسپی رکھنے کا ذکر رہا۔ناظم صاحب تعلیمات کی تحریک پر جمیع مہمانوں نے ایستادہ ہو کر نواب صدرالمہام بہادر کا جام صحت نوش کیا اس کے بعد مہتمم صاحب تعلیمات نے ضلع سے متعلق سررشتہ کی جدید اسکیمات و اصلاحات کا خاکہ پیش کرتے ہوئے صوبہ گورنمنٹ کے آغاز، انجمن اساتذہ کے قیام، موجودہ ناظم صاحب تعلیمات کے دورے، ناظم صاحب کی تنظیم جدید کی رو سے (۴۵) جدید مدارس کے متوقعہ افتتاح کا ذکر کیا صدرالمہام بہادر کے دورہ سے متعلق کہا کہ نواب صاحب نے مدارس کے معائنہ کے بعد جن دل افزا ارشادات سے اپنے ماتحتیں کی حوصلہ افزائی کی ہے اس کے نتیجے کے طور پر ابتدائی تعلیم اور مدارس کا کام خوش اسلوبی سے سرانجام پانے کی توقع ہے۔ آخر میں اپنی اور صدر مدرس صاحب مدرسہ فوقانیہ کی

جانب سے نواب صدرالمہام بہادر، معزز عہدہ داران سررشتہ، صاحب ضلع اور جملہ مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ازاں بعد نواب صاحب ممدوح نے ناظم صاحب تعلیمات کی اعلیٰ اور قابل قدر کارگزاری کی تعریف و توصیف کی، صدر مہتمم صاحب و مہتمم صاحب تعلیمات اور صدر مدرس صاحب فوقانیہ کی عمدہ کارگزاریوں کا اعتراف کیا، اور ناظم صاحب تعلیمات کی ماہرانہ قیادت میں اس سمت کا کام خوش اسلوبی سے انجام پانے پر اطمینان کا اظہار کیا۔ آخر میں صاحب ضلع اور دیگر عہدہ داران مقامی کے تعاون عمل پر اظہار مسرت فرمایا۔ تقریباً دس بجے شب واپسی ہوئی۔

---

۴ مردے ۱۳۵۲ف روز دوشنبہ۔ نواب صدرالمہام بہادر نے صبح میں جمیع عہدہ داران تعلیمات، کے ساتھ مدرسہ فوقانیہ کے بازدیگاہ پر تشریف لا کر اراکین انجمن اساتذہ مستقر محبوب نگر کو تصویر کشی کی شرکت سے اعزاز بخشا اور جمیع اساتذہ صاحبان کو خدا حافظ فرمایا۔ یہاں سے سمت بادے پلی روانگی عمل میں آئی عہدہ داران تعلیمات بھی ساتھ ہی روانہ ہوئے صاحب ضلع اور اکثر مقامی عہدہ داران بادے پلی کی جدید تعمیر شدہ گنج کے روبرو وہاں کے معززین و ساہوکاراں کے ساتھ موجود تھے۔ گنج اور بعض گرنیوں کے معائنہ کے بعد بادے پلی کی تجارتی ترقی پر اظہار مسرت فرمایا اس کے بعد نواب ظہیر یار جنگ بہادر و دیگر عہدہ داراں سے رخصت ہو کر نواب صدرالمہام بہادر تعلیمات بلدہ واپس ہوئے۔ ڈاک بنگلہ کے قریب نواب صاحب م... نے عہدہ داراں تعلیمات کو خدا حافظ کہا۔ اس کے بعد میں جناب ناظم صاحب تعلیمات و صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ روانہ ہوئے اور عہدہ داراں مقامی کی مستقر کو واپسی ہوئی اس طرح نواب ظہیر یار جنگ بہادر اول تعلقدار و جمیع عہدہ داران مقامی کے اشتراک عمل سے نواب صدرالمہام بہادر کا دورہ نہایت کامیابی سے اختتام کو پہنچا۔ تمام سررشتہ جات نے اپنی کارکردگی کا بہترین مظاہرہ کیا۔ سررشتہ کے مستقبل کی نسبت نواب صاحب ممدوح نے جن زیر غور تجاویز اور آیندہ زرعی

وجرفتی لائحہ عمل کا تذکرہ فرمایا اُس سے پبلک کو مسئلہ تعلیم کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل ہوئے، تعلیمی مسائل سے دلچسپی ہو گئی۔ اور نواب صاحب کے دل افزا بیانات سے جوش عمل میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کے ورود مسعود کا ایک مستقل افادہ ہے جس کے پرچہ سے ضلع محبوب نگر مدتوں مستفید ہوتا رہے گا۔

جشن سالگرہ مبارک مدرسہ تحتانیہ (میاں پہل)

بصدارت جناب راجہ سوامی صاحب دیسائی قصبہ ہذا صبح ۹ ساعت جلسہ شروع ہوا طلبا وجرانال بالمقطع نے سلامی دی مدرسہ کی چند لڑکوں نے کنڑی میں ترانہ سنایا اسپورٹس عمل میں آئے برکات عہد عثمانی پر تقریریں ہوئیں تقسیم انعامات وشیرینی وغیرہ کے بعد دعائے اعلیحضرت بندگانعالی و شہزادگان و شہزادیاں بلند اقبال پر جلسہ ختم ہوا اور شام میں منجانب مدرسہ مساجد و منادریں چراغیں لگوائے گئے اور دعا مانگی گئی۔

جشن سالگرہ مبارک مدرسہ تحتانیہ خوش پنجی تعلقہ کہم ضلع ورنگل۔

بتاریخ صدر صبح (۸) ساعت ترانہ کے ساتھ طلبہ کا جلوس نکالا گیا۔ پرچم آصفی نصب کر کے طلبہ اور مدرسین نے بمعیت جناب سید مجیح حسین صاحب مددگار تعلقدار صاحب ڈویژن کہم سلامی دی پھر ۴ ساعت شام بصدارت مددگار صاحب موصوف جلسہ منعقد ہوا طلبا نے نظمیں پڑھیں شہری اور دہقانی کا مکالمہ اور سچائی پر ڈرامہ کیا گیا برکات دور عثمانی پر تقریریں ہوئیں صدر جلسہ کے تقریر کے بعد شیرینی تقسیم کی گئی اور جلسہ برخاست ہوا۔

جشن سالگرہ مبارک مدرسہ تحتانیہ قصبہ ہملی ضلع عثمان آباد۔

بتاریخ صدر صبح میں قرأت سے جلسہ شروع ہوا طلبائے مدرسہ نے مدحیہ اور دعائیہ اشعار سنائے مقامی پولیس نے شبیہ مبارک کو سلامی دی اور جلوس نکالا گیا سہ پہر میں طلبا نے ناعاقبت اندیشی کے عنوان پر بزبان اردو اور سپریم کے عنوان پر بزبان مرہٹی ڈرامے کئے اور بزبان انگریزی گوئنگ ٹو اسکول" پر مکالمہ سنایا مسٹر بابوراؤ پٹواری قصبہ نے مٹھائی تقسیم کی صدر مدرسہ نے خاندان آصفیہ کی مختصر تاریخ اور بندگانعالی کے عہد حکومت کے تفصیلی معلومات بیان کئے مولوی سعید احمد صاحب نے فرائض رعایا و والی حکومت کی عظمت پر تقریر کی دعائے بندگانعالی و شہزادگان و شہزادیاں بلند اقبال پر جلسہ برخاست ہوا اس جلسہ کو کامیاب بنانے میں مسٹر بابو راؤ صاحب پولیس پٹیل مولوی وحید الدین صاحب جمعدار پولیس اسٹیشن ہوز قابل ذکر ہیں۔

جلسہ سالگرہ مبارک مدرسہ تحتانیہ ویلپور ضلع نظام آباد۔

بتاریخ صدر ۳ ساعت روز حمد خدا اور ترانہ الہی تا جہاں باشد سے جلسہ کا آغاز ہوا پرچم آصفی کو سلامی دی گئی ۴ بجے اسپورٹس ہوئے۔ عطریان سے حاضرین کی ضیافت کی گئی۔ طلبہ کو انعامات تقسیم کرنے کے بعد محمد عبدالکریم صاحب صدر مدرسہ نے دعائے عمر و اقبال اعلیٰ حضرت بندگانعالی و شہزادگان مانگی اور جلسہ ختم ہوا۔

جشن سالگرہ مبارک مدرسہ تحتانیہ قصبہ سالگنڈہ ضلع رائچور۔

بتاریخ صدر ۴½ ساعت معززین و طلبا کے ساتھ جلوس نکالا گیا شبیہ مبارک کی گلپوشی ہوئی پرچم آصفی بلند کیا گیا طلبائے اسکوٹ نے سلامی دی بصدارت نائب امین صاحب کروڑگیری حمد و نعت سے جلسہ شروع

ہوا۔ برکات دورعثمانی پر بزبان کنٹری جشن سالگرہ کی اہمیت، برکات دورعثمانی علم کی اہمیت اور دیہی طبقہ کو اتحاد عمل دباہمی تعاون کی ترغیب پر تقریریں ہوئیں۔ جاگیردار صاحب تعلقہ نے اعلیحضرت بندگان عالی وشہزادگان وشہزادیان بلند اقبال کے لئے دعا مانگی اور نادار طلبہ کو پارچہ اور طلبائے مدرسہ کو شیرینی تقسیم فرمائی مدرسہ کے لئے ایک الماری بطور عطیہ عنایت فرمائی مولوی شہاب الدین صاحب صدر مدرس نے مہمانوں کا تشکریہ ادا کیا اور جلسہ برخواست ہوا

جشن سالگرہ مبارک مدرسہ تحتانیہ ملجال ضلع محبوب نگر

بتاریخ صدر شبیہ مبارک کی گلپوشی ہوئی طلبہ کا جلوس نکالا گیا بعد واپسی جلوس شبیہ مبارک کو سلامی دی گئی حمد ونعت اور مختلف نظمیں سنائی گئیں۔ مسٹر رام چیندر ریڈی صدر مدرسہ نے بندگان عالی کے احسانات اور ترقیوں کا مختصر اور جامع الفاظ میں تذکرہ کیا جلسہ کے اختتام پر مقدماں قصبہ وچنیا صاحب ساہو نے غریب اور نادار لڑکوں کو اٹھارہ عدد کپڑے سلیٹ قلم پنسل تقسیم فرمائے حاضرین کی شیرینی سے تواضع کی گئی

جلسہ سالگرہ مبارک مدرسہ تحتانیہ کنٹری یادگیر۔

بتاریخ صدر ساعت پرچم آصفی کے اور ترانہ کے ساتھ جلوس نکالا گیا۔ بمقام محبوب کلب پہلے پونیں مقامی اور عروب نے اس کے بعد طلبہ نے دعائیہ نظم کے بعد پرچم آصفی کے سامنے سلامی دی طلبائے مسلم نے مساجدمیں اور طلبائے ہنود نے مندروں میں بندگان عالی اور شہزادگان وشہزادیاں بلند اقبال کے لئے عمر و اقبال کی دعا مانگی۔

افتتاح کنڈرگارٹن کلاس مدرسہ وسطانیہ کوٹگل

بتاریخ ۲۶ر شہریور ۱۳۴۶ف بصدارت مولوی سید نور المنیب اللہ صاحب منصف تعلقہ بموجودگی معزز عہدہ داران و پبلک کنڈرگارٹن کلاس کا افتتاح عمل میں آیا۔ مولوی عظمت علی خاں صاحب ماہر کنڈرگارٹن ٹریننگ کالج گلبرگہ نے جو تقریر فرمائی اس کا خلاصہ حسب ذیل تھا۔

آپ نے موجد کنڈرگارٹن فروبل کا ذکر کر کے کہا کہ اس طریقۂ تعلیم میں ۴ تا ۶ سال کے عمر کے لڑکوں کو کھیل کے ذریعہ اس طرح تعلیم دی جاتی ہے کہ انہیں تعلیم دی جانا محسوس نہ ہو کیونکہ طلبا میں کامل نمو کے انسان کے تمام قوائے ناقص حالت میں ودیعت رہتے ہیں جن کی تربیت کھیل کے ذریعہ ہوتی ہے۔ مدرس کو ماہر نفسیات ہونا چاہئے۔ طلبا اور مدرس میں بدرجہ کمال موانست ہو۔ طلبا کی شوخی وغیرہ فطری عادتوں کو نہ روکنا چاہیئے نیز بچوں کو کھیل سے باز نہ رکھنا چاہیئے کیونکہ کھیل ہی سے اشیاء کی حقیقت شناسی تحفظ حقوق قانون اور اصول کی پابندی کی عادتیں پیدا ہوتی ہیں اسی سے صحت اور دماغ کا نشو ونما ہے بچوں کی بعض فطرتیں بروقت تربیت پذیر ہوتی ہیں اس لئے وقت پر ان کی تربیت ہونی چاہیئے تاکہ وہ مادے اور قوائے فنا نہ ہو جائیں قدیم تعلیم میں سماعت و بصارت ذریعہ تعلیم تھے مگر کنڈرگارٹن کے ذریعہ تعلیم دینے میں جملہ قوائے فکری کام کرتے ہیں اس کے بعد عملی طریقۂ تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے قدیم طریقہ سے تعلیم پائے ہوئے طلبا اور کنڈرگارٹن کے ذریعہ تعلیم پانے والے طلبا کا فرق بتایا بہرحال آپ نے کنڈرگارٹن کے طریقۂ تعلیم کے استحسان کو موثر دلائل سے ثابت کیا اور عملی طور پر سبق دے کر طلبا کی دلچسپی اور انہماک کا بخوبی مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد صدر صاحب مدرسہ مولوی کرامت علی صاحب نے اپنے مدرسہ کے ان مجبوریات کا حال بیان کیا جب کہ بغیر آلات و تحائف کے تعلیم دی جاتی ہے اور سال حال آلات تعلیمی کی رقم منظور ہونے اور آلات تعلیمی بذریعہ مولوی عظمت علی خاں صاحب تیار کرنے کا ذکر کیا۔ سب کے آخر میں صدر صاحب جلسہ نے طریقۂ تعلیم کنڈرگارٹن

کی تعریف اور تقریر سے دلچسپی ظاہر فرمائی اور صدر مدرسہ اور مولوی عظمت علی خاں صاحب کے مساعی کو قابل قدر قرار دیا۔

کشتگی اسکوٹ کیمپ بتاریخ ۶ مہر ۱۳۴۶ف ۔ بجے شام اسکوٹ جن کی تعداد ۳۲ تھی بہ نگرانی اساتذہ صاحبان متعلقہ بمقام نالہ نرسی روانہ ہوئے اتفاق سے اس روز خوب بارش ہوئی اور راستہ میں ایک زہریلا سانپ اسکوٹ کے پیروں کے نیچے آگیا جس کو اسکوٹ نے بڑی بہادری سے مار ڈالا۔ طلبہ کو قدرتی منظر سے لطف اندوزی کا موقع دیا گیا آگ سلگا کر سردی کی تکلیف دور کی گئی۔ قواعد اسکوٹ کے مطابق کیمپ قائم کر کے تین تین اسکوٹ کا چالیس چالیس منٹ کے لئے پہرا دیا گیا رات بسر ہوئی پھر صبح ۵ بجے نماز کے بعد پرچم آصفی لہرایا گیا۔ خدا کی تعریف کے بعد ترانہ سنایا گیا۔ پٹرول لیڈرس نے کیمپ کو صاف اور ستھرا کر دیا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر ۱½ ساعت تک ڈنڈوں کی ڈرل اور اسکوٹنگ کے مختلف کھیل کھلائے گئے۔ رسی اور ڈنڈوں کے ذریعہ پل بنا کر نالہ عبور کیا گیا۔ سہ پہر میں اسکوٹ ماسٹر صاحب نے اسکوٹ کے فرائض اور خدمت خلق پر تقریر کی ۱ ساعت تک ٹریکنگ کا کھیل کھلایا گیا ۵ بجے واپسی عمل میں آئی۔

جلسہ تقسیم اسناد مدرسہ وسطانیہ سدا سیو پیٹھ بتاریخ ۶ مہر ۱۳۴۶ف جناب ناظم صاحب ورزش جسمانی نے طلبا مدرسہ کے ورزشی کرتب گیمس اور ماس ڈرل کا معائنہ فرمایا بعد ختم معائنہ بصدارت موصوف تقسیم کتب انعامی کا جلسہ منعقد ہوا مولوی معین الدین صاحب مددگار مدرسہ نے مدرسہ کی ترقیوں طلباء کے حصول انعامات ٹورنمنٹ وغیرہ کے بارے میں رپورٹ سنائی صدر صاحب جلسہ نے طلباء کی کامیابی وحصلہ انعامات پر مبارکباد دی اور ماس ڈرل کی تعریف کی اور فرمایا کہ جب یہ مدرسہ ایسی ترقی کر رہا ہے تو اس کو تحتانیہ

تحتانیہ بنانے کی تحریک سے محفوظ رکھا جائے اس کے ساتھ ہی آپ نے مدرسہ کے لئے محکمہ امداد کا وعدہ فرما کر تقسیم انعامات فرمائے۔ مولوی قمر الدین صاحب صدر مدرس نے پُر خلوص الفاظ میں جناب ناظم صاحب ممدوح کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا

جلسہ تقسیم انعامات
مدرسہ تحتانیہ امیر پیٹھ بلدہ

بتاریخ ۱۲ مہر ۱۳۴۶ف زیر صدارت مولوی سید محی الدین صاحب قادری بی۔ اے پرسنل مددگار نظامت آبکاری سرکار عالی جلسہ منعقد ہوا۔

جس میں اولیائے اطفال، بعض صدر مدرس صاحبان مدارس تحتانیہ۔ مسٹر سندر راج نائیڈو میکانکل انجینیر محکمہ دار الضرب، مولوی نظیر حسین شریف صاحب ناظر مدارس بلدہ مسٹر رنگا ریڈی دیسمکھ، مولوی عبد الصمد صاحب نائب منتظم محکمہ معتمدی امور عامہ اور دیگر معززین محلہ نے شرکت فرمائی۔ مسلمان طلبہ نے قرأت ہنود طلبہ نے پرارتھنا سے محظوظ کیا صدر مدرس صاحب نے رپورٹ مدرسہ کے ساتھ مدرس کے فرائض مدرسہ کی سالانہ کارگزاری، طلباء کی ایتھلٹک اسپورٹس بابتہ ۱۳۴۶ف میں شرکت قلعہ گولکنڈہ کی سیر نتیجہ امتحان سالانہ کی تفصیل سنائی رپورٹ میں نواب مسعود جنگ بہادر مرحوم سابق ناظم تعلیمات سرکار عالی کے انتقال پر ملال پر اظہار تاسف کیا گیا اور جناب مولوی سید علی اکبر صاحب سابق صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کے تبدل سے رنج اور ترقی سے مسرت کا اظہار کیا گیا اور جناب مولوی فیض الدین صاحب کی نسبت صدر مہتمی تعلیمات بلدہ پر فائض ہونے کی توقع ظاہر کی گئی سب کے آخر یہ رپورٹ دعائے بندگان عالی متعالی و صاحبزادگان و صاحبزادیان بلند اقبال کے عمر و اقبال کی دعا پر ختم ہوئی اس کے بعد انعامات تقسیم ہوئے صدر نشین صاحب نے فاضلانہ و ناصحانہ تقریر فرمائی حاضرین کے شکریہ ادا کر کے جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ تقسیم انعام مدرسہ تحتانیہ سانگڑی عادل آباد

بتاریخ ۵ر آذر ۱۳۴۶ف ۴ ساعت شام بصدارت مسٹر گوبیندراؤ دیسپانڈیہ جلسہ منعقد ہوا رعایائے قصبہ و دیگر مواضعات علاقہ عظمت مدار کو مدعو کیا گیا قراءت سے افتتاح ہوا طلبا کی حمد وثنا اور دعا اعلیحضرت بندگان عالی کے بعد پرچم آصفی لہرایا گیا۔ دو طالب علموں نے علم و دولت پر زبان اُردو تقریریں کیں چھوٹے طلبا نے دلچسپ قصے سنائے۔ تلوار اور قلم پر ڈراما اسٹیج کیا گیا پھر صدر صاحب مدرسہ نے تعلیمی طلبا تحریص پر بسیط تقریر اور طلبا کو نصیحت کی اور مسٹر لکشمن سوداگر قصبہ نے علم کے عنوان پر اپنے خیالات ظاہر کئے۔ غریب طلبا کو تعلیمی اشیاء کتب، سلیٹ، پنسل وغیرہ تقسیم کئے گئے۔ صدر صاحب مدرسہ مسٹر سیتارام راؤ نے پُوفنڈ کا حساب حاضرین کو بتا کر مطمئن کیا۔ یہ ایک خوشی کی بات تھی کہ مقامی زمیندار و مقدم مالی صاحبان نے بھی جلسہ میں شرکت فرمائی آخر میں حاضرین کی پان سگریٹ سے تواضع کر کے دعائے اعلیحضرت بندگان عالی و شہزادگان اقبال پر جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ انجمن مباحثہ مدرسہ وسطانیہ کوڑنگل

بتاریخ ۱۳ر آذر ۱۳۴۷ف زیر صدارت جناب مولوی نور المنیب اللہ صاحب منصف تعلقہ ہذا انجمن مباحثہ کا پہلا جلسہ منعقد ہوا مضمون زیر بحث علم و عمل تھا ۳۲ طلبا نے تقریریں کیں اکثریت علم کی حمایت میں رہی پھر مددگار صاحبین مدرسہ نے تقریریں کیں آخر پر صدر نشین صاحب نے تقریر میں علم و عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے طلبا کی تفہیم کی کہ علم و عمل دونوں ترقی کے لئے لازم و ملزوم ہیں صحیح علم وہی ہے جو عملی قوی کو طاقت بخشے۔

مولوی سید محمد سعید صاحب معتمد انجمن نے شکریہ ادا کیا اور جلسہ مولوی عبدالرحیم خاں صاحب صدر مدرسہ کے حسن انتظام سے کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا۔